قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۷ شمارہ: ۱۲
ذوالحجہ: ۱۴۳۵ھ - اکتوبر: ۲۰۱۴ء
قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِ سالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفی

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی 74800، پوسٹ بکس نمبر 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-101900 برانچ کوڈ: 0816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی 74800

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: +92-21-34919531
Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرست مضامین

بصائر وعبر

حج مبرور کی علامت !	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات ومضامین

بنیادی اسلامی احکام اوران کا شرعی معنی ومصداق !	۸	محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
عہدِ رسالت میں صحابہ کرامؓ کی فقہی تربیت (قسط:۵)	۱۲	مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی
فلسفۂ قربانی اور ملحدین کے شکوک وشبہات	۱۷	مفتی محمد راشد ڈَسکوی
اسلام میں صنفِ نازک کی رعایت !	۲۴	جناب عبداللہ صاحب
امام بخاریؒ کے تدریسی منہج کے اصول	۳۲	مولانا سعید الحق جدون
گناہ اور معصیت ! آفات اور پریشانیوں کا سبب	۴۱	محمد شفیق الرحمٰن علوی
فرض نمازوں کے بعد دعا کی اہمیت (قسط:۲)	۵۰	مولانا عمران ولی
الفاظِ طلاق سے متعلقہ اُصولوں کی تفہیم وتشریح (قسط:۱۰)	۵۵	مفتی شعیب عالم

دار الافتاء

مدارس میں پیشگی تنخواہ دینے کا حکم !	۶۳	ادارہ

www.banuri.edu.pk

حج مبرور کی علامت!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلام علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

انسان ہو یا حیوان، شجر ہو یا حجر، جمادات ہوں یا نباتات، عبادات ہوں یا مطلق اعمال، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر ایک کی ہیئت، صورت اور ظاہری شکل بنائی ہے اور ایک اس کا باطنی وجود و روح اس میں مقرر کی ہے۔ اور ان دونوں کے ملاپ سے چیز وجود میں آتی اور برقرار رہتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک ہو اور دوسری نہ ہو تو وہ چیز نہ وجود میں آتی ہے اور نہ ہی اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ مثلاً: عالم ارواح میں انسان کی روح تھی، لیکن جسم نہ تھا، اس لیے خالی روح کو کسی نے انسان نہیں کہا۔ عالم دنیا میں جب انسان بچہ کی صورت میں پیدا ہوا تو روح اور جسم سے مرکب تھا، لیکن انسانی وجود سے روح جیسے ہی خارج ہوئی تو اب وہ انسانی ڈھانچہ، میت یا لاش تو کہلایا، کسی نے اس کو کامل اور مکمل انسان نہیں کہا۔

یہی حال اعمال کا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان اعمال کی ایک ہیئت وصورت اور شکل بنائی ہے اور ایک اس میں روح رکھی ہے، مثلاً: نماز‘ قیام، رکوع، سجود اور تشہد پر مشتمل ہے، یہ نماز کی ظاہری صورت اور شکل ہے اور مسلمان نماز صرف اپنے خالق و مالک اور اپنے معبود برحق کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہی پڑھتا ہے، یہ اس کی روح اور حقیقت ہے۔ روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد، علم، حتیٰ کہ ایک ایک عمل میں یہی دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور عمل کو مقبولیت کے درجہ تک پہنچاتی ہیں، جیسا کہ نماز کی ظاہری ہیئت وشکل کے بارہ میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’صلوا کما رأیتمونی أصلی ‘‘۔ (بخاری، ج:۲،ص:۸۸۸) ..... ’’نماز اسی طرح ادا کرو جس طرح مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو‘‘۔ یعنی نماز پڑھنے کا طریقہ اور انداز بھی وہی ہونا چاہیے جو آپ ﷺ نے اپنایا اور اختیار کیا۔ اس طریقہ میں جان بوجھ کر تبدیلی کی گئی یا عدم توجہی اختیار کی گئی تو وہ نماز اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کا درجہ نہیں پا سکے گی، جیسا کہ ایک

صحابیؓ مسجد نبوی میں تشریف لائے اور اپنے انداز میں نماز پڑھی، آپ ﷺ نے اُسے فرمایا: ''ارجع فصل فإنک لم تصل۔'' (بخاری، ج:۱،ص:۱۰۹،طبع:قدیمی)...... ''جاؤ! نماز پڑھو، تم نے صحیح طریقے سے نماز ادا نہیں کی۔'' گویا نماز کی شکل وصورت کا لحاظ از حد ضروری ہے۔

اسی طرح نماز صرف اور صرف اپنے رب کی رضا کے حصول اور اس کی خوشنودی کے لیے پڑھنا چاہیے، اس میں ریا، دکھاوا اور کوئی غلط نیت نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''من صلّی یرائی فقد أشرک۔'' (مشکوٰۃ،ص:۴۵۵)...... ''جس نے ریا کاری کے طور پر نماز ادا کی، اس نے شرک کیا''۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اُسے کہا جائے گا کہ جس کے لیے تم نے نماز پڑھی تھی، اس کا ثواب بھی اسی سے وصول کرو۔

اسی طرح حج کی بھی ایک ظاہری شکل ہے کہ حاجی محرم ہو، مرد ہے تو احرام کی علامت دو چادروں میں لپٹا ہو، زبان پر تلبیہ کا ترانہ، بیت اللہ کا طواف، حجر اسود کا استلام، طواف کے بعد مقامِ ابراہیم کے پاس دوگانہ واجب الطّواف، پھر استلام کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور دعائیں ہوں، آٹھ ذوالحجہ سے نو ذوالحجہ کی صبح تک منیٰ میں قیام اور پانچ نمازوں کی ادائیگی کا اہتمام ہو، نو ذوالحجہ زوال سے مغرب تک عرفات میں وقوف ہو، غروبِ آفتاب کے بعد مزدلفہ کی طرف کوچ ہو، مغرب وعشا کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا دھیان اور فکر ہو۔ دس ذوالحجہ کی صبح کو سورج نکلنے سے پہلے منیٰ کی طرف روانگی، پھر جمرہ عقبہ کی رمی، قربانی، حلق، طوافِ زیارت، طوافِ وداع۔ یہ سب اعمال حج کی شکل اور صورت ہیں اور اس شکل وصورت کا ہر لحاظ سے خیال رکھنا ضروری ہے۔

اسی طرح ان افعال واعمال کو کرنا جس طرح آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا ہے، انہیں ایام میں کرنا جو اس کے لیے مخصوص ہیں، اسی ترتیب سے کرنا جس ترتیب پر آپ ﷺ نے کیا ہے اور انہی مقامات: بیت اللہ، صفا، مروہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ پر ان کو کرنا حج کہلاتا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر انہیں مقامات اور انہیں ایام میں حج کے افعال واعمال کرکے بتلایا اور فرمایا تھا: ''لتأخذوا مناسککم۔'' (مشکوٰۃ،ص:۲۳۰)..... ''کہ مجھ سے حج کا طریقہ سیکھ لو۔'' اسی طرح حج کی ایک روح بھی ہے اور اس کی رعایت کرنا بھی انتہائی ضروری ہے، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَیْہِ سَبِیْلاً وَمَنْ کَفَرَ فَإِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ''۔ (آل عمران:۹۷)

ترجمہ: ''اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف چلنے کی اور جو نہ مانے تو پھر اللہ پرواہ نہیں رکھتا جہاں کے لوگوں کی''۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''من حج للّٰہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ أمہ۔'' (مشکوٰۃ،ص:۲۲۱)

ترجمہ: ''جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے حج کیا اور کوئی بے ہودگی اور گناہ کا کام نہیں کیا تو وہ اس دن کی طرح لوٹے گا جس دن اس کی ماں نے جنا''۔

اسی طرح جب حج کی ظاہری شکل وصورت کا بھی خیال رکھا جائے اور اس کی روح کو بھی اپنایا جائے تو ایسا حج' حج مبرور کہلاتا ہے، جس کا ثواب جنت ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''**العمرة من العمرة كفارة لما بينهما والحج المبرور ليس لهٗ جزاء إلا الجنة**''۔ (مشکوۃ، ص:۲۲۱)

ترجمہ: ''عمرہ کے بعد عمرہ کرنا دونوں کے درمیان گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کی جزاء جنت کے علاوہ کچھ نہیں۔''

یعنی حج مبرور کرنے والے کے صرف گناہ معاف نہیں ہوتے، بلکہ بلاحساب وکتاب اُسے جنت کا داخلہ نصیب ہوجاتا ہے، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمرات کرتے ہوئے یہ دعائیں کرتے تھے:

''**اَللّٰهم اجعله حجًّا مبرورًا وذنبًا مغفورًا**۔'' (السنن الکبریٰ للبیہقی، ج:۵، ص:۲۱۱، طبع: دار الکتب العلمیۃ بیروت)

.....''اے اللہ! ہمارے حج کو حج مبرور بنادے اور ہمارے گناہوں کو معاف فرمادے۔''

حج مبرور کیسے بنے گا؟ اس کی کیا علامات ہیں؟ اس بارہ میں علمائے کرام کے کئی اقوال ہیں:

۱:.......حج مبرور وہ حج ہے جس میں حج کے مسائل اور اس کے مناسک پر پورے طور سے عمل ہوا ہو، مکمل طور پر اُسے ادا کیا گیا ہو، یہ اسی وقت ہوگا جب حج کی ادائیگی شریعت اور سنت کی روشنی میں ہوگی، اپنی من مانی اور رخصتوں کو، گنجائشوں کو تلاش کرکے خلافِ سنت نہ کیا گیا ہو، نہ دم اور صدقہ واجبہ سے تلافی کی گئی ہو، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: ''**الحج الذی وفیت أحکامه ووقع موقعًا**''۔ (فتح الباری، ج:۳، ص:۲۹۸)

۲:.......حج مبرور وہ حج ہے جس میں ریا اور شہرت نہ ہو: ''**الذی لاریاء ولا سمعة فیه**''۔ (شرح لباب، ص:۲۹، مرعاۃ، ص:۹۶) یعنی حج میں یہ ذہن میں نہ ہو کہ لوگ جان لیں، تاکہ مجھ کو اچھا سمجھیں، لوگوں کو معلوم اور ظاہر ہوجائے کہ میں حج کی سعادت حاصل کررہا ہوں، لوگ میرے معتقد ہوجائیں، مجھے حاجی کہیں۔ اس سے آج کل عوام کا بچنا مشکل ہورہا ہے۔ ایسی بات اختیار کرتے ہیں جس سے ریا اور شہرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لوگوں میں اعلانِ اشتہار ہوتا ہے، ایک بھیڑ جمع کی جاتی ہے. روانگی اور واپسی میں جشن منایا جاتا ہے، اسٹیج پر کرسی پر بیٹھ کر مجمع میں حج کے واقعات اور اپنا کارنامہ بیان کیا جاتا ہے، جس کا مقصد لوگوں میں تعریف حاصل کرنا ہوتا ہے، پس ایسا حج' حج مبرور کی صفت سے خالی ہے۔ روانگی کے وقت گھروں پر اور ائیر پورٹ پر جشن کی شکل دیکھئے! تب اندازہ ہوگا۔

۳:.......حج مبرور وہ ہے جو قبول ہوجائے: **الحج المبرور المقبول**۔ (فتح الباری، ج:۳، ص:۲۹۸) ظاہر ہے کہ حج میں مقبولیت کی شان اسی وقت پیدا ہوگی جب اس میں حرام یا ملا جلا مال یا مشتبہ مال نہ لگا یا ہو، خالص اللہ کی رضا کے لیے کیا گیا ہو، تقویٰ، خوف خدا، شریعت اور سنت کے طریقہ پر کیا گیا ہو۔

۴:.......حج مبرور وہ حج ہے جس میں کوئی گناہ شامل نہ ہو: ''**الحج المبرور الذی لایخالطه**

شیء من المأثم'' (عمدۃ، ج:۹،ص:۱۳۳، شرح لباب،ص:۲۹) یعنی حج کے امور میں سے کوئی بات ایسی نہ ہوئی ہو، جس کی تلافی دم یا صدقہ واجبہ سے کی گئی ہو یا یہ کہ حج میں عام گناہ، جیسے: بدنگاہی، بے پردگی، غیبت، ایذارسانی، جھگڑا، وغیرہ جو گناہ غفلت اور نفس کی وجہ سے ہوجاتے ہیں، وہ نہ ہوئے ہوں، یہ بھی بڑی ہمت اور عزیمت کی بات ہے۔ عموماً عورتیں بے پردگی بہت کرتی ہیں، جس کی وجہ سے حج مبرور کی فضیلت سے محروم ہوجاتی ہیں۔

۵:...... حج مبرور کی علامت یہ ہے کہ حج کے بعد گناہوں سے بچتا ہو، گناہوں کا ارتکاب نہ ہوتا ہو، یعنی پہلے کے مقابلہ میں اس میں احتیاط پیدا ہوگئی ہو، چونکہ گناہ کی سزا مواخذہ اور مبرور کی جزا جنت دونوں میں تضاد ہے: ''**الذی لایعقبه معصیة**''۔ (ابن ماجہ، کتاب الحج، ج:۲،ص:۹۶۴، طبع: دارالفکر، بیروت)

۶:...... حج مبرور کی علامت یہ ہے کہ حج کے بعد اس کے حالات پہلے سے بہتر ہوگئے ہوں، تقویٰ اور نیکی کے امور میں زیادتی ہوگئی ہو۔ (معارف،ص:۲۳۲) اعمال حسنہ اور ذکر وعبادت وغیرہ پہلے سے زائد ہورہے ہوں، آخرت کے اعمال میں زیادتی ہو: ''**من علامات القبول أنه إذا رجع یکون حاله خیرًا ما کان**''۔ (معارف، ج:۲،ص:۲۳۲)

۷:...... حج مبرور وہ ہے جس میں حج کے بعد دنیا سے زہد، بے پرواہی اور آخرت کی جانب رغبت ہو: ''**أن یرجع زاهدًا فی الدنیا راغبًا فی الآخرة**''۔ (القریٰ،ص:۳۴، شرح لباب،ص:۳۰)

پس جو حجاج کرام ان تمام باتوں کی رعایت کریں گے اور جن میں یہ باتیں پائی جائیں گی، وہ حج مبرور کے مستحق ہوں گے۔ حجاج کرام کو چاہیے کہ وہ اپنے حج کو حج مبرور بنانے کی کوشش فرمائیں۔

حجاج کرام کے پیش نظر رہے کہ حج میں توحید اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا مظاہرہ ہے، اس میں اپنے نفس اور خواہش کو بالکل آڑے نہ آنے دیں۔ اسی طرح سفرِ حج سفرِ آخرت کا نمونہ بھی ہے، جیسے مرنے والا کفن میں لپٹا ہوا بے یارومددگار پڑا ہوتا ہے اور دوسروں کے رحم وکرم پر ہوتا ہے، اسی طرح حاجی کو بھی چاہیے کہ احرام پہن لینے کے بعد اب اپنی مرضی، اپنی چاہت سب کچھ ختم کرکے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہوجائے۔

حاجی کو سوچنا چاہیے کہ جن مقاماتِ مقدسہ میں جارہا ہے، یہ وہ تمام مقامات ہیں جہاں انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اولیائے عظام، علماء، صلحاء، اتقیاء اور بزرگانِ دین رحمۃ اللہ علیہم تشریف لائے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتِ بیکراں اور فیوضِ غیرمتناہیہ کا افاضہ ہوا تھا، امید ہے کہ جب حاجی ان کا اتباع کرے گا اور ان افعال کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے گا تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوگا۔

حج ایک امتحان بھی ہے، جو سچے عاشق ہوتے ہیں وہ تکالیف اور مصائب کی پرواہ نہیں کرتے، وہ سب کچھ اپنے محبوب کی رضا اور خوشنودی کے لیے برداشت کرتے ہیں۔ حجاج کرام کو چاہیے کہ وہ نیت کریں کہ میں اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور خوشنودی کے لیے ہی حج کررہا ہوں۔ ریا، نمود ونمائش اور شہرت میرا مطلوب ومقصود نہیں اور نہ ہی حج کے نام پر سیر وسیاحت، تفریح اور آب وہوا کی تبدیلی کے لیے حج کا سفر اختیار کیا ہے۔ علمائے کرام اور بزرگانِ دین نے حجاج کرام کے لیے جو نصائح اور ہدایات تلقین کی

ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اُنہیں یہاں نقل کر دیا جائے:

''۱:...... آدمی کو چاہیے کہ روانگی سے قبل اپنے ملنے والوں سے معافی تلافی کرالے، تاکہ اگر سفر میں موت آجائے تو معاملہ صاف ہو۔

۲:...... روانگی سے قبل دو رکعت نفل ادا کرے اور دل میں تصور ہو کہ یہ نمازِ استغفار پڑھ رہا ہوں۔

۳:...... پھر نفل ادا کرنے کے بعد مراقبہ کرے، آنکھ بند کرکے دل میں سن بلوغ سے آج تک گناہوں کا تصور کرے اور ساتھ ہی اپنی ذلت، رسوائی اور اللہ کی عزت وعظمت کا تصور کرے، پھر اپنے گناہوں پر پشیمانی کا تصور کرے، پھر دعا مانگے کہ کہ یا اللہ! میں آئندہ کوئی گناہ نہ کروں گا، اب مجھے بخش دے، مگر دو رکعت نفل کے بعد مراقبہ سے قبل تین بار ''استغفر اللّٰہ ربی من کل ذنب وأتوب إلیہ'' پڑھ لے۔

۴:...... مکہ شریف میں جا کر مراقبۂ موت ''کل نفس ذائقة الموت'' کرے، پھر شب کو ۳۱۳ بار ''لاإلٰہ إلا اللّٰہ'' کا ذکر کرے۔

۵:...... مکہ مکرمہ میں صدقہ وخیرات میں کثرت کی جائے، اس لیے کہ یہاں ایک کا لاکھ ملتا ہے۔

۶:...... مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ کے رہنے والے اگر غیرشرعی کام بھی کریں تو نہ وہاں سعودیہ میں اور نہ واپس آکر اپنے ملک میں، نہ دل میں اور نہ زبان سے کسی غیر کے سامنے ان کی عیب جوئی کرے، کیونکہ وہ اللہ کے شہر والے ہیں اور وہ مدینہ والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر والے ہیں، ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ان کی عیب جوئی کریں۔ اور یہ بات اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناپسند ہے۔

۷:...... جب مدینہ منورہ یا روضۂ رسول اللہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) دکھائی دے، درود کثرت سے شروع کردے۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے غسل یا وضو کرے اور دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی زیارت کرے، اس وقت پڑھے: ''الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللّٰہ!'' اس کے بعد ''السلام علیک یا أبابکر الصدیقؓ خلیفة رسول اللّٰہ!'' پھر پڑھے: ''السلام علیک یا عمر بن الخطاب خلیفة رسول اللّٰہ!'' مدینہ شریف میں حتیٰ الوسع نماز مسجد نبوی میں پڑھنی چاہیے اور مسجد قبا میں بھی کچھ نوافل وغیرہ پڑھنی چاہئیں۔ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلٰی التَّقْوٰی، یہ مسجد قبا کی تعریف میں فرمایا گیا ہے۔ مقام احد میں جاکر زیارت کرنا اور وہاں دعا مانگنا کہ یا اللہ! ان شہداء کے طفیل میرے قلب کو منور فرما اور جنت البقیع میں روزانہ یا کبھی کبھی زیارت کے لیے جانا اور وہاں بھی دعاء مذکورہ بالا مانگنا چاہیے اور سفر حج میں جو دعائیں بزرگوں نے لکھی ہوئی ہیں، وہ ضروری نہیں، بلکہ مدینہ منورہ میں فرض وسنت کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی کثرت رکھنی چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مسلمانوں کو حج مبرور کی سعادت سے نوازیں اور بار بار اپنے گھر کی مقبول حاضری نصیب فرمائیں۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

بنیادی اسلامی احکام اوران کا شرعی معنی ومصداق!

محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

ایمان وکفر، نفاق والحاد، ارتداد وفسق

جس طرح نماز، زکوۃ، روزہ اور حج اسلام کے بنیادی احکام وعبادات ہیں اور دینِ اسلام میں ان کے مخصوص معنی اور مصداق متعین ہیں، قرآن وحدیث کی نصوص اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل سے ان کی حقیقتیں اور عملی صورتیں واضح ومسلم ہوچکی ہیں اور چودہ سوسال میں امت محمدیہ اور اس کے علماء ومحققین ان کو جس طرح سمجھتے اور عمل کرتے چلے آئے ہیں، اس تواتر وتوارثِ عملی نے اس پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ ان عبادات واحکام اور ان نصوص کی تعبیرات کو ان کے متواتر شرعی معانی سے نکال کر کوئی نئی تعبیر اور نیا مصداق قرار دینا یقیناً دین سے کھلا ہوا انحراف ہے۔ ٹھیک اسی طرح کفر، نفاق، الحاد، ارتداد اور فسق بھی اسلام کے بنیادی احکام ہیں، دین اسلام میں ان کے بھی مخصوص ومتعین معنی اور مصداق ہیں۔ قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعی طور پر ان کی تعیین وتحدید فرمادی ہے، ان الفاظ کو بھی ان شرعی معانی ومصادیق سے نکالنا کھلا ہوا دین سے انحراف ہوگا اور ان کو ازسرنو محل بحث ونظر بنانا اور امت نے چودہ سوسال میں ان کے جو معنی اور مفہوم سمجھے اور جانے ہیں، نو بنو تاویلیں کرکے ان سے ہٹانا کھلا ہوا الحاد وزندقہ ہوگا۔

ایمان کا تعلق قلب کے یقین سے ہے اور خاص خاص چیزیں ہیں جن کو باور کرنا اور ماننا ایمان کے لیے ضروری ہے، جو کوئی ان کو نہ مانے قرآن کریم کی اصطلاح اور اسلام کی زبان میں اس کا نام کفر ہے اور وہ شخص کافر ہے۔ جس طرح ترکِ نماز، ترکِ زکوٰۃ، ترکِ روزہ اور ترکِ حج کا نام فسق ہے، بشرطیکہ ان کے فرض ہونے کو مانتا ہو، صرف ان پر عمل نہ کرتا ہو۔ اور اگر انہی تعبیرات، صلاۃ، زکوٰۃ، صوم، حج کو اختیار کرنے کے بعد کوئی شخص ان کو معروف ومتواتر شرعی معنی سے نکال کر غیر شرعی معنی میں استعمال کرے یا ان میں ایسی تاویلیں کرے جو چودہ سوسال کے عرصہ میں کسی بھی عالم دین نے نہ کی ہوں تو اس کا نام قرآن کی اصطلاح اور اسلام کی زبان میں الحاد

ہے۔ قرآن کریم نے ان الفاظ: کفر، نفاق، الحاد، ارتداد کو استعمال فرمایا ہے اور جب تک روئے زمین پر قرآن کریم موجود رہے گا، یہ الفاظ بھی انہی معانی میں باقی رہیں گے۔

اب یہ علماء امت کا فریضہ ہے کہ وہ امت کو بتلائیں کہ ان کا استعمال کہاں کہاں صحیح ہے اور کہاں کہاں غلط ہے؟! یعنی یہ بتلائیں کہ جس طرح ایک شخص یا فرقہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد مؤمن ہوتا اور مسلمان کہلاتا ہے، اسی طرح ان ایمان کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے والا شخص یا فرقہ کافر اور اسلام سے خارج ہے، نیز علماء امت کا یہ فرض ہے کہ ان حدود وتفصیلات کو یعنی ایمان کے تقاضوں کو اور ان کفریہ عقائد واعمال وافعال کو متعین کریں، جن کے اختیار کرنے سے ایک مسلمان اسلام سے خارج ہوجاتا ہے، تاکہ نہ کسی مؤمن کو کافر اور اسلام سے خارج کہا جاسکے اور نہ کسی کافر کو مؤمن ومسلمان کہا جاسکے۔ ورنہ اگر کفر وایمان کی حدود اس طرح مشخص ومتعین نہ ہوئیں تو دین اسلام بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا اور جنت وجہنم افسانے۔

یاد رکھئے! اگر ایمان ایک متعین حقیقت ہے تو کفر بھی ایک متعین حقیقت ہے۔ اگر کفر کے لفظ کو ختم کرنا ہے اور کسی کافر کو بھی کافر نہیں کہنا ہے تو پھر ایمان واسلام کا بھی نام نہ لو اور کسی بھی فرد یا قوم کو نہ مؤمن کہو نہ مسلمان۔ رات کے بغیر دن کو دن نہیں کہہ سکتے، تاریکی کے بغیر روشنی کو روشنی نہیں کہہ سکتے، پھر کفر کے بغیر اسلام کو اسلام کیونکر کہہ سکتے ہو؟ اور پھر یہ کہنا اور فرق کرنا بھی سرے سے غلط ہوگا کہ یہ مسلمانوں کی حکومت ہے اور یہ کافروں کی اور یہ تو اسلامی حکومت ہے اور وہ کفریہ حکومت ہے، پھر تو حکومت سیکولر اسٹیٹ یعنی لادینی حکومت ہوگی، غرض کفر اور کافر کا لفظ ختم کرنے کے بعد تو اسلامی حکومت کا دعویٰ ہی بے معنی ہوگا یا پھر یہ لفظ الیکشن جیتنے کے لیے ایک دل کش نعرہ اور حسین فریب ہوگا۔

غرض یہ ہے کہ علماء پر- کچھ بھی ہو- رہتی دنیا تک یہ فریضہ عائد ہے اور رہے گا کہ وہ کافر پر کفر کا حکم اور فتویٰ لگائیں اور اس میں پوری پوری دیانت داری اور علم وتحقیق سے کام لیں اور ملحد وزندیق پر الحاد وزندقہ کا حکم اور فتویٰ لگائیں اور جو بھی فرد یا فرقہ قرآن وحدیث کی نصوص وتصریحات کی رو سے اسلام سے خارج ہو، اس پر اسلام سے خارج اور دین سے بے تعلق ہونے کا حکم اور فتویٰ لگائیں، جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو، قیامت نہ آجائے۔

چونکہ کفر واسلام کے حکم لگانے کا معاملہ بے حد اہم اور انتہائی نازک ہے اور ایک شخص جذبات کی رو میں بھی بہہ سکتا ہے اور فکر ورائے میں غلطی بھی کرسکتا ہے، اس لیے علماء امت کی ایک معتمد علیہ جماعت جب اس کا فیصلہ کرے گی تو وہ فیصلہ یقیناً حقیقت پر مبنی اور شک وشبہ سے بالاتر ہوجائے گا۔

بہرحال کافر، فاسق، ملحد، مرتد وغیرہ شرعی احکام واوصاف ہیں اور فرد یا جماعت کے عقائد یا اقوال وافعال پر مبنی ہوتے ہیں، نہ کہ ان کی شخصیتوں اور ذاتوں پر، اس کے برعکس گالیاں جن کو دی جاتی

ہیں ان کی ذاتوں اور شخصیتوں کو دی جاتی ہیں، لہٰذا اگر یہ الفاظ صحیح محل میں استعمال ہوتے ہیں تو یہ شرعی احکام ہیں، ان کو سب وشتم اور ان احکام کے لگانے کو دشنام طرازی کہنا یا جہالت ہے یا بے دینی، ہاں! کوئی شخص غیظ وغضب کی حالت میں یا ازراہِ تعصب وعناد کسی مسلمان کو کافر کہہ دے تو یہ بے شک گالی ہے اور یہ گالی دینے والا خود فاسق ہوگا اور تعزیر کا مستحق اور اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی واقعی مسلمان کو کافر کہہ دے تو یہ کہنے والا خود کافر ہو جائے گا۔

علماء حق جب کسی فرد یا جماعت کی تکفیر کرتے ہیں تو درحقیقت ایک کافر کو کافر بتلانے والے اور مسلمانوں کو اس کے کفر سے آگاہ کرنے والے ہوتے ہیں، نہ کہ اس کو کافر بنانے والے، کافر تو وہ خود بنتا ہے۔ جب کفریہ عقائد یا اقوال وافعال کا اس نے ارتکاب کیا اور ایمان کے ضروری تقاضوں کو پورا نہیں کیا، وہ باختیارِ خود کافر بن گیا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مولویوں کو کافر بنانے کے سوا اور کیا آتا ہے؟ سراسر جہالت ہے یا بے دینی۔

اگر علماء ایمانی حقائق اور اسلام کی حدود کی حفاظت نہ کرتے تو اسلام کا نام ہی صفحہ ہستی سے کبھی کا مٹ چکا ہوتا، جس طرح کسی حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی مملکت کی حدود کی حفاظت کرے اور ان کے تحفظ کے لیے فوجی طاقت اور دفاعی سامانِ جنگ وغیرہ کی تیاری میں ایک لمحہ کے لیے غافل نہ ہو، اسی طرح ایمان، اسلام، اسلامی معاشرہ، مسلمانوں کے دین وایمان کو ملحدوں، افترا پردازوں اور جاہلوں کے حملوں سے محفوظ رکھنا علماء حق اور فقہاء امت کے ذمہ فرض ہے۔

ابھی چند دنوں کا قصہ ہے جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا اور حکومتِ پاکستان نے جہاد کا اعلان کیا اور پاکستان کی افواج قاہرہ اور عوام نے اس جہاد میں جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا تو بھارت کے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ پاکستان ''اسلامی حکومت'' نہیں ہے اور یہ لڑائی اسلامی جہاد نہیں ہے اور اگر ہے تو پھر ہندوستان بھی اسی طرح دار الاسلام ہے جس طرح پاکستان۔ اسلامی قانون نہ وہاں نافذ ہے نہ یہاں۔ مسلمان وہاں بھی رہتے ہیں یہاں بھی۔

بھارت کو یہ کہنے کا موقع کیوں ملا؟ صرف اس لیے کہ نہ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ ہے اور نہ اسلامی معاشرہ موجود ہے۔ یہ ہماری وہ کمزوریاں ہیں جن سے دشمن نے ایسے نازک موقع پر فائدہ اٹھایا۔ اگر اس ملک کے اندر نبوت کا مدعی اور ختم نبوت کا منکر مرزا غلام احمد قادیانی کی امت (مرزائی فرقہ) بھی مسلمان ہے اور پورے اسلام کے چودہ سو سالہ اسلامی عبادات ومعاملات کے نقشہ کو مٹا ڈالنے والا اور جنت ودوزخ سے صریح انکار کرنے والا غلام احمد پرویز اور اس کی جماعت بھی مسلمان ہے اور اگر قرآن کے منصوص احکام کو عصری تقاضوں کے سانچوں میں ڈھالنے والا، سنت رسول کو ایک تعاملی اصطلاح اور رواجی قانون بتلانے والا، سود کی حرمت سے قرآن کو خاموش بتا کر حلال کرنے والا بھی نہ

صرف مسلمان ہے، بلکہ اسلامی تحقیقاتی ادارہ کا سربراہ ہے تو پھر یادرہے کہ محض قرآن کریم کو ’’زردوزی‘‘ کے سنہری حروف میں لکھوانے سے قرآن کی حفاظت قیامت تک نہیں ہوسکتی اور یہ دعویٰ انتہائی مضحکہ خیز ہے یا پھر عوام کو بے وقوف بنانے کا ہتھکنڈہ ہے۔

ابھی کل تک یہی ملحدین مسلمانوں کو طعنہ دیا کرتے تھے کہ قرآن مجید اس لیے نازل نہیں ہوا ہے کہ ریشمی رومالوں میں لپیٹ کر اس کو بوسے دیئے جائیں، پیشانی سے لگایا جائے اور سروں پر رکھا جائے، یہ تو مسلمانوں کے لیے ایک عملی قانون ہے، عمل کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔ پھر آج اس حقیقت سے یہ بے اعتنائی کیوں ہے کہ باہمی رضامندی سے زنا کو جرم نہیں قرار دیا جاتا۔ بینکاری سود کو شیرِ مادر کی طرح حلال قرار دے کر خود حکومت سود لے رہی اور دے رہی ہے۔ ریس کورس جیسی مہذب قمار بازی کے، شراب کی درآمد وبرآمد اور خرید وفروخت کے لائسنس دیئے جارہے ہیں، نکاح وطلاق ووراثت کا قانون سب صریح قرآن وسنت کی تصریحات کے خلاف جاری ہے، جرائم اور سزاؤں کا تو کہنا ہی کیا۔ غرض قرآن وسنت کو بالائے طاق رکھ کر قانون سازی کا سلسلہ جاری ہے اور زردوزی کے سنہری حرفوں میں لکھوا کر قرآن عظیم کی حفاظت کا اہتمام بھی کیا جارہا ہے۔ نہایت صبر آزما حقائق ہیں۔ آخر مسلمانوں کو کیا ہوگیا کہ اتنے واضح حقائق کی فہم کی توفیق بھی سلب ہوگئی؟ **أللّٰھم اھد قومی فإنھم لایعلمون۔**

www.banuri.edu.pk

عہدِ رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فقہی تربیت

اور اُس کے نتائج وثمرات

(پانچویں قسط)

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

اُصولِ استنباط کی تشکیل وتدوین میں مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے تلامذہ کی مساعی جمیلہ

حقیقت یہ ہے کہ شریعت کے تمام ابواب میں غور وخوض کرنے اور شریعت کے اصول کی روشنی میں اسلامی معاشرے میں پیش آنے والے مشکل مسائل کو حل کرنے کے اصولِ استنباط اور قواعد استخراج کی تشکیل وتدوین میں ائمہ مجتہدین اور ان کے شاگردوں کی مساعی جمیلہ کا یہ ثمرہ ہے، چنانچہ شیخ عبدالقادر بغدادی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۴۲۹ھ ''أصول الدین'' میں فرماتے ہیں کہ:

صحابہؓ میں سے چار صحابی رضی اللہ عنہم

۱:......حضرت علی رضی اللہ عنہ، ۲:......عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ۳:......زید بن ثابت انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ، ۴:......عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے تمام ابوابِ فقہ (شریعت) میں بحث کی ہے۔ یہ چار صحابی رضی اللہ عنہم کسی مسئلے میں کسی قول پر اتفاق کریں تو مبتدع کے سوا کہ فقہ میں اس کے اختلاف کا اعتبار نہیں، مسلم امہ اُن کے قول پر مجتمع ہو جاتی ہے اور اُسے اجماع کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر وہ مسئلہ جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے قول کے مقابلے میں اپنی رائے اور قول میں منفرد ہوں، اس میں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ انصاری رحمۃ اللہ علیہ (۷۴-۱۴۸ھ/ ۶۴۰-۷۶۵ء) عامر بن شرحبیل شعبی کوفی رحمۃ اللہ علیہ (۱۹-۱۰۳ھ/ ۶۴۰-۷۲۱ء) اور عبیدہ بن عمرو سلمانی رحمۃ اللہ علیہ (۷۲ھ/ ۶۹۷ء) ان کی اتباع کرتے ہیں۔ اور ہر وہ مسئلہ جس میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ منفرد ہوئے، اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وشافعی رحمۃ اللہ علیہ اکثر ان کی پیروی کرتے ہیں اور مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے ان کے فرزند حضرت خارجہ رحمۃ اللہ علیہ یقیناً انہی کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ اور ہر وہ مسئلہ جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما منفرد ہوئے، اس میں عکرمہ بن عبداللہ بربری مدنی رحمۃ اللہ علیہ (۲۵-۱۰۵ھ/ ۶۴۵-۷۲۳ء) اور سعید بن جبیر کوفی رحمۃ اللہ علیہ (۴۵-۹۵ھ/ ۶۶۵-۷۱۴ء) ان کی اتباع کرتے ہیں۔

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

اور ہر وہ مسئلہ جس میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ منفرد ہوئے، اس میں علقمہ بن قیس نخعی کوفی رحمۃ اللہ علیہ (۶۲ھ/ ۶۸۱ء) اسود بن یزید نخعی کوفی رحمۃ اللہ علیہ (۷۵ھ/ ۶۹۴ء) اور ابوثور ابراہیم بن خالد کلبی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ (۱)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں ان مذکورہ بالا اربابِ فقہ ونظر اور مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کی فقہی بصیرت ودقت نظر کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان سے مروی احادیث کی موجودگی میں قیاس کی اجازت نہیں دیتے، چنانچہ امام فخر الاسلام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''راوی کو اگر تفقہ اور اجتہاد میں شرفِ تقدم وشہرت حاصل ہے، جیسا کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم ہیں اور ان کے علاوہ بھی صحابہؓ ہیں جن کو فقہ ونظر میں شہرت حاصل ہے، ان کی حدیث حجت ہے، ان کی حدیث کے مقابلے میں قیاس کو چھوڑا جائے گا۔ اور راوی اگر عدالت اور حفظ میں مشہور ومعروف ہے، لیکن فقہ میں مشہور نہیں، جیسے: حضرت ابوہریرہؓ وحضرت انس رضی اللہ عنہما ہیں، ایسے راوی کی حدیث اگر قیاس کے مطابق ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر اس کی حدیث قیاس کے مخالف ہے تو اس حدیث کو نہیں چھوڑا جائے گا، مگر ضرورت کی وجہ سے (یعنی قیاس کا دروازہ مطلقاً بند نہ کیا جائے، بلکہ قیاس کیا جائے گا)۔'' (۲)

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ مذکورہ بالا ائمہ مجتہدین کی مختصر جماعت کو یہ امتیاز وخصوصیت اس لیے حاصل تھی کہ ان برگزیدہ شخصیات کے اجتہادات پر صحت وسلامتی کی مہر تصدیق بارگاہِ رسالت سے ثبت ہوچکی تھی اور انہیں افتاء وتعلیم کی اجازت حاصل تھی، چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۲۳۹ھ ''فتاویٰ عزیزی'' میں رقمطراز ہیں:

''کسانیکہ بحضورِ آں جناب ﷺ بپایۂ اجتہاد کامل رسیدہ بودند و آنحضرت ﷺ اجتہاداتِ ایشاں را تصویب فرمودند وبفتویٰ وتعلیم اجازت فرمودہ بودند، مثل حضرت عمرؓ، وعلیؓ، ومثل عبداللہ بن مسعودؓ، ومعاذ بن جبلؓ وزید بن ثابت وامثالہم رضی اللہ عنہم''۔ (۳)

''رسول اللہ ﷺ کے حضور میں جنہیں اجتہاد کامل نصیب تھا اور حضور اکرم ﷺ نے ان کے اجتہادات پر مہر تصدیق ثبت فرمائی اور انہیں فتویٰ وتعلیم دینے کی اجازت دی تھی، جیسے: حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور انہی کی طرح بعض دوسری شخصیات ہیں رضی اللہ عنہم۔''

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ کا فقہی مقام حضرت عمر رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ کی نظر میں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردوں کو اجتہاد وفقہی بصیرت میں ایسا پختہ کیا تھا

کہ دورِ فاروقی و عثمانی اور عہدِ مرتضوی میں کوفہ کا قاضی حضرت شریح رحمۃ اللہ علیہ (۸۷ھ/ ۶۹۷ء) کو بنایا گیا تھا، جنہوں نے بعض مقدمات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف فتویٰ دیا تھا اور اُنہیں عہدۂ قضا سے معزول نہیں کیا گیا، چنانچہ ابوبکر الجصاص رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت شریح رحمۃ اللہ علیہ کو کوفہ کا قاضی بنایا اور ان کے فیصلوں پر اعتراض نہیں کیا، باوجودیکہ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے مسئلوں میں ان سے اختلاف کیا۔''(۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو آتے دیکھا تو حاضرین مجلس سے فرمایا: ''کنیف ملئَ علمًا''...... ''یہ علم بھرا باڑا ہے''...... دوسری مرتبہ فرمایا: ''کنیفٌ ملئَ فقهًا''...... ''تفقہ و فقہی بصیرت سے بھرا باڑا ہے''۔(۵)

خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کو: ''أصحاب سرج هذه القرية''(۶)...... ''یہ اس بستی (کوفہ) کے علمی چراغ ہیں''...... کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اس سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کے علمی مقام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شاگردانِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فقہی مرتبہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی نظر میں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما قدر کرتے اور جب وہ آتے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کی دعوت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد آتے تو وہ ان کے لیے کھانا تیار کراتے، انہیں بلاتے تھے، مسروق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ایک بار انہوں نے ہمارے لیے کھانا تیار کیا، پھر مسائل پوچھنے اور فتویٰ دینے لگے اور مسائل میں ہماری مخالفت کرنے لگے، ہمیں جواب دینے سے یہی بات مانع رہی کہ ہم ان کے یہاں کھانے پر مدعو تھے (یہ موقع بحث و مباحثہ کے لیے موزوں نہیں تھا، اس لیے ہم نے اس سے گریز کیا)۔''(۷)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کا عہدِ صحابہؓ میں اجتہاد اور خدمتِ افتاء

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ عہدِ صحابہؓ میں اجتہاد کرتے تھے اور ان کے فتووں کو مانا جاتا تھا، چنانچہ امام ابواسحاق الشیرازی الشافعی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۴۷۶ھ تحریر فرماتے ہیں:

''أصحاب عبدالله بن مسعودؓ کشریحؒ والأسودؒ وعلقمةؒ کانوا یجتهدون فی زمن الصحابةؓ ولم ینکر علیهم أحد''۔(۸)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد جیسے قاضی شریحؒ، اسودؒ اور علقمہ رحمہم اللہ

عہدِ صحابہؓ میں اجتہاد کرتے تھے اور کسی نے ان پر نکیر نہیں کی۔''

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کا روایتی وثقاہتی معیار

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کو فقہ وحدیث میں جو مرتبہ ومقام حاصل تھا، اس کا اندازہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے، موصوف لکھتے ہیں:

''اور لیکن اہل حدیث جیسے شعبہؒ اور یحییٰ بن سعید القطانؒ اور ارباب صحاح ستہ وسنن، حفاظ اور غیر ثقات میں تمیز کرتے تھے، چنانچہ وہ کوفہ اور بصرہ کے ایسے ثقہ راویوں کو جن کی ثقاہت شک وشبہ سے بالاتر ہے، خوب جانتے تھے اور ان میں بہت سے ایسے راوی بھی ہیں جو بہت سے حجازی راویوں سے بھی افضل و برتر تھے۔ اور کوفی عالم حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی ثقاہت کے متعلق شک وشبہ میں پڑتا ہی نہیں تھا، جیسے علقمہؒ، اسودؒ، عبیدہ سلمانیؒ، حارث تیمیؒ، شریح قاضیؒ، ابراہیم نخعیؒ، حکم بن عتیبہؒ، ان کے بعد اُنہی جیسے حفاظ رواۃ سب سے زیادہ معتبر اور سب سے بڑھ کر حافظ موجود تھے۔ چنانچہ علماء اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ شناسانِ حدیث نے جن حدیثوں کو صحیح قرار دیا ہے، ان سے استدلال اور حجت پیش کرنا درست ہے۔ ان اہل علم کا تعلق خواہ کسی شہر سے ہو، اور ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی حدیثوں کو جن کی روایت میں ہر شہر کے علماء منفرد ہیں، انہیں ایک کتاب میں جمع کیا ہے جو ''مفاريد أهل الأمصار'' کے نام سے مشہور ہے۔''(۹)

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی کوفہ میں تعلیمی خدمات کا فیضان

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی تعلیمی خدمات کے متعلق محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۱۰ھ کے بھائی نامور عالم انس بن سیرین بصری رحمۃ اللہ علیہ (۳۴-۱۲۰ھ/ ۶۷۵-۷۳۸ء) کا بیان قاضی حسن بن خلاد رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۳۶۰ھ نے بسند متصل ''المحدث الفاصل'' میں زینتِ کتاب کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''قدمت الكوفة قبل الجماجم فرأيت فيها أربعة آلاف يطلبون الحديث وأربع مائة قد تفقهوا''۔(۱۰)

''میں دیرجماجم کے واقعہ یعنی ۸۲ھ سے پہلے کوفہ میں گیا تو میں نے دیکھا کہ یہاں چار ہزار طلبۂ حدیث پڑھتے تھے اور چار سو طلبہ فقیہ بن چکے اور فقہی بصیرت حاصل کر چکے تھے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد تابعینؒ میں صرف کوفے میں چار سو فقیہ موجود تھے۔ دوسرے اسلامی قلمرو کے بلاد اور دیہات کا کیا ذکر؟ ذرا نظر کو بلند کیجئے! عہد صحابہؓ میں کسی صحابیؓ کے شاگردوں کو کہیں ایسے القاب سے یاد کیا گیا ہے اور کیا کسی مجتہد کی تعلیمی وتدریسی خدمات کو خلافت راشدہ میں ایسے شاندار

الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ کو پیش کیا ہے؟ یہ نتیجہ وثمرہ اس فقہی بصیرت کا ہے جو انہیں حاصل تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی تعلیمی وتدریسی خدمات کے عہدِ اموی میں جوشاندار نتائج وثمرات اور ان کے دیرپا اثرات کوفہ میں نکلے، اس کی نظیر اسلامی قلمرو کے وسیع وعریض قطعہ میں کہیں اور مشکل سے ملے گی۔

عہدعباسی میں اس کا اثر کوفہ میں حدیث کی گرم بازاری

کوفہ میں حدیث کی گرم بازاری کا اندازہ قاضی حسن بن خلاد رامہرمزی رحمۃ اللہ علیہ (تقریباً ۲۶۰-۳۶۰ھ/۸۷۳-۹۷۳ء) نے ''المحدث الفاصل'' میں محدثِ بغداد حافظ عفان بن مسلم بصری رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۰-۲۲۰ھ/ ۷۴۷-۸۳۵ء) سے بسند متصل نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''فقد منا الكوفة فأقمنا أربعة أشهر، ولو أردنا أن نكتب مائة ألف حديث لكتبناها، فما كتبنا إلا قدر خمسين ألف حديث وما رضينا من أحد إلا بالإملاء إلا شريكًا، فإنه أبى علينا وما رأينا بالكوفة لحانًا مجوزًا ''۔(۱۱)

''ہم کوفہ میں آئے تو چار مہینے ٹھہرے، ہم اگر یہاں یہ چاہتے کہ ایک لاکھ حدیثیں لکھیں تو لکھ سکتے تھے، مگر ہم نے صرف پچاس ہزار حدیثیں لکھیں، پھر کسی اور سے املا کے علاوہ راضی نہ ہوئے، مگر شریک کے سوا کہ انہوں نے ہم سے انکار کیا اور ہم نے کوفہ میں کسی ایسے آدمی کو نہیں دیکھا کہ جو عربیت میں غلطی کرے اور اس کو روا رکھے۔''

عفان رحمۃ اللہ علیہ نے جس شہر میں چار مہینے میں پچاس ہزار حدیثیں لکھیں، اس شہر میں حدیث کی کثرت کا کیا ٹھکانا!۔

حواشی وحوالہ جات

۱:......أصول الدین، تالیف عبدالقادر البغدادی، استانبول، مطبعۃ الدولۃ ۱۳۴۶ھ، ص:۳۱۱۔
۲:......أصول البزدوی، ص:۱۵۸-۱۵۹۔
۳:......فتاویٰ عزیزی، دہلی، مطبع مجتبائی، ۱۳۴۱ھ، ج:۱، ص:۱۱۸۔
۴:......أصول الجصاص، ج:۲، ص:۱۵۶-۱۵۷۔
۵:......الطبقات الکبریٰ، ج:۲، ص:۳۴۴۔
۶:......تاریخ الثقات للعجلی، طبع ۱۴۰۵ھ، ص:۲۷۶۔
۷:......أصول الجصاص، ج:۲، ص:۱۵۶-۱۵۷۔
۸:......أبواسحاق شیرازی الشافعی، کتاب اللمع۔
۹:......مجموع الفتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، الریاض ۱۳۹۸ھ، ج:۲۰، ص:۳۱۷۔
۱۰:......المحدث الفاصل، ص:۵۶۰۔
۱۱:......المحدث الفاصل، ص:۵۵۹۔

(جاری ہے)

فلسفۂ قربانی اور ملحدین کے شکوک وشبہات

مفتی محمد راشد ڈَسکوی

اسلام کا فارسی میں ترجمہ ہے: گردن نہادن، اردو میں گردن جھکانا، خم کرنا، جب گردن جھکانے کا محرک اطاعت وفرمانبرداری کے جذبات ہوں تو اُسے اردو میں تسلیم خم بھی کہا جاتا ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری کے جذبہ سے گردن جھکانے والے کو مسلم کہتے ہیں، اسی سے مسلم یا مسلمان اصطلاح سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان یا مسلم احکام الٰہی کے سامنے تسلیم خم کرنے یا گردن جھکانے والے کو کہتے ہیں۔ مسلمان کا جذبۂ ایمانی ہمیشہ اُسے تیار رکھتا ہے کہ جو بھی حکم الٰہی جب اور جیسے اس کی طرف متوجہ ہو، اُسے بجالایا جائے، وہ اُسے بلاچوں وچرا قبول کرلیتے ہیں، لیکن بعض کج رو، کج فہم اور کوتاہ نظر اپنے مقامِ حقارت سے اوپر اچھل اچھل کر اللہ تعالیٰ کے بعض احکام کو اپنی ناقص عقل کی گھسی پٹی کسوٹی پر پرکھ کر قبول یا رد کرنے کی ناروا جسارت کرنے لگتے ہیں اور ایسے لوگ جب ابلاغی ذرائع کا حصہ ہوں یا ذرائع ابلاغ تک ان کی رسائی میں کوئی مشکل نہ ہو تو وہ اسلامی احکام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور اپنی کج فہمی کے مسموم جراثیم مسلمانوں کے درمیان عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسے ہی اسلامی احکام میں اہم پرحکمت حکم' قربانی کا حکم بھی ہے جو امت مسلمہ' سالانہ بجالاتی ہے اور بھرپور جذبۂ ایمانی سے ادائیگی کا اہتمام کرتی ہے، مگر ایک عرصہ سے بعض نادان اس سنت ابراہیمی سے متعلق اپنے فاسد خیالات کو عام کرنے کی کوشش کررہے ہیں، اس لیے ماہ ذوالحجہ کی مناسبت سے مناسب معلوم ہوا کہ قربانی سے متعلق ایسے ملحدین کے سطحی شکوک وشبہات کا علمی جائزہ لیا جائے، آئندہ سطور میں یہی کوشش کی جارہی ہے۔

ہر جدید تہذیب وتمدن کا دلدادہ اور مغربیت سے متأثر ذہنیت رکھنے والا اس ماہِ مبارک کے شروع ہوتے ہی سادہ لوح اور مذہب پسند مسلمانوں کا ذہن خراب کرنا شروع کردیتا ہے کہ قربانی کی وجہ سے جانوروں کی نسل کشی ہوتی ہے، لاکھوں لوگوں کی یہ رقمیں بلاوجہ ضائع ہوتی ہیں، اس کے بجائے اگر اتنا مال رفاہِ عامہ کے مفید کاموں، ہسپتالوں کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کیا جائے، تو معاشرے کے بہت بڑے غریب اور مفلس طبقے کا بھلا ہو جائے گا، یہ افراد بھی زندگی کی ضروری سہولتوں سے فائدہ اٹھاسکیں گے، وغیرہ وغیرہ، اس طرح منکرینِ قربانی اپنی عقلِ نارسا سے کام لیتے ہوئے بزعمِ خود قربانی کے نقصانات

اور ترکِ قربانی کے فوائد بیان کرتے نظر آتے ہیں اور اس کی وجہ سے عام مسلمان ان نام نہاد دانشوروں کے زہریلے پروپیگنڈے اور بہکاوے میں آکر اسلام کے اس عظیم الشان حکم کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ان دنوں (دس ذوالحجہ) میں دائمی عمل

اس صورتِ حال میں سب سے پہلے تو غور کرنے کی یہ بات ہے کہ عیدالاضحیٰ کے اس خاص موقع پر اگر قربانی کرنے کی بنسبت انسانیت کی فلاح و بہبود میں مال خرچ کرنا اتنا ہی افضل، موزوں و مناسب یا ضروری ہوتا تو جناب نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں اہلِ ثروت اور صاحبِ نصاب مسلمانوں پر قربانی کے حکم کے بجائے غریب، سسکتی اور بدحال انسانیت پر مال خرچ کرنا ضروری قرار دیا جاتا، جب کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر دور میں غریب اور نادار طبقہ موجود رہا ہے، تو یقیناً آپ ﷺ کے مبارک دور میں بھی یہ طبقہ موجود تھا، بلکہ ایسے افراد تو بکثرت موجود تھے، لیکن رحمۃ للعالمین ﷺ (جو اپنی امت کے لیے بہت ہی زیادہ شفیق اور مہربان تھے) نے اپنے زمانہ کے اہلِ ثروت اور صاحبِ نصاب مسلمانوں کو اس (عیدالاضحیٰ کے) موقع پر یہ حکم نہیں دیا کہ وہ اپنا مال رفاہِ عامہ کے مفید کاموں، ہسپتالوں کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کریں، بلکہ یہ حکم فرمایا کہ اس موقع پر اللہ کے حضور جانور کی قربانی پیش کریں۔ اور خود رسول اللہ ﷺ کا دائمی عمل ان دنوں میں قربانی کرنے کا ہی تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں دس سال قیام فرمایا (اس قیام کے دوران) آپ ﷺ قربانی کرتے رہے:''**عن ابن عمرؓ، قال: ''أقام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالمدینۃ عشر سنین، یضحی ''** ۔ (سنن الترمذی، الأضاحی، باب الدلیل علی أن الأضحیۃ سنۃ، رقم الحدیث: ۱۵۰۷) اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس عظیم حکم کو ہمیشہ قائم و دائم رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کرنا ہی افضل، اولیٰ اور ضروری ہے۔

ایامِ قربانی میں قربانی افضل ہے یا نقد صدقہ؟

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''قربانی کے ایام میں بنسبت صدقہ کرنے کے قربانی کرنا افضل ہے۔'' امام ابوداؤد، امام ربیعہ اور ابوالزناد رحمہم اللہ وغیرہ کا یہی مسلک ہے۔ (المغنی لابن قدامہ: ۱۱/۶۹)

نبی اکرم ﷺ، ان کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا یہی عمل تھا۔ اگر ان حضرات کے نزدیک اس سے بہتر کوئی عمل ہوتا تو وہ یقیناً قربانی کی بجائے اسی کو اختیار کرتے، دوسری بات یہ کہ ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا، جب کہ نبی اکرم ﷺ کا صریح فرمان مبارک موجود ہے کہ: ''اس دن میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک (قربانی کے جانور کا) خون بہانے سے بڑھ کر بنی آدم کا کوئی عمل پسندیدہ نہیں ہے۔'' **(عن عائشۃ رضی اللّٰہ عنہا أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: ''ما عمل آدمی من عمل یوم النحر أحب إلی اللّٰہ من إہراق الدم۔''** (سنن الترمذی، فضل الأضحیۃ، رقم الحدیث: ۱۴۹۳)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

فرمایا: ’’کسی کام میں مال خرچ کیا جائے تو وہ عید الاضحیٰ کے دن قربانی میں خرچ کیے جانے والے مال سے افضل نہیں‘‘۔ **عن ابن عباسؓ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ’’ماأنفقت الورق فی شیئ أفضل من نحیرۃ فی یوم العید‘‘**۔ (سنن الدارقطنی، کتاب الأشربۃ، باب الصید والذبائح والأطعمۃ، رقم الحدیث: ۴۳)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی طرح ذکر کرتے ہیں کہ صحیح احادیثِ مشہورہ کی بنا پر شوافع کے نزدیک ان دنوں میں قربانی کرنا ہی افضل ہے، نہ کہ صدقہ کرنا، اس لیے کہ اس دن قربانی کرنا شعارِ اسلام ہے، یہی مسلک سلف صالحین کا ہے۔ (المجموع شرح المہذب: ۸/ ۴۲۵)۔ البتہ! وہ افراد جن پر قربانی کرنا واجب نہیں ہے، اُن کے لیے یا اُن کی طرف سے قربانی کرنے کی بجائے صدقہ کرنا افضل شمار ہوگا۔ (البحر الرائق: ۸/۲۰۲) صاحب مرعاۃ المفاتیح شارح مشکاۃ المصابیح لکھتے ہیں کہ: ’’بعض فقہاء کے نزدیک قربانی واجب ہے اور بعض کے نزدیک سنت مؤکدہ، لیکن بہرصورت اس دن میں قربانی کرنا یعنی: خون بہانا متعین ہے، اس عمل کو چھوڑ کر جانور کی قیمت صدقہ کردینا کافی نہیں ہوگا، اس لیے کہ صدقہ کرنے میں شعائرِ اسلام میں سے ایک بہت بڑے شعار کا ترک لازم آتا ہے، چنانچہ! اہل ثروت پر قربانی کرنا ہی لازم ہے۔‘‘ (مرعاۃ المفاتیح: ۵/۷۳)

کیا قربانی سے جانوروں کی نسل کُشی ہوتی ہے؟

ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا یہ نظام چلا آرہا ہے کہ انسانوں یا جانوروں کو جس چیز کی ضرورت جتنی زیادہ ہوتی ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کی پیدائش اور پیداوار بڑھا دیتے ہیں اور جس چیز کی جتنی ضرورت کم ہوتی ہے تو اس کی پیداوار بھی اتنی ہی کم ہو جاتی ہے، آپ پوری دنیا کا سروے کریں، اچھی طرح جائزہ لیں کہ جن ممالک میں قربانی کے اس عظیم الشان حکم پر عمل کیا جاتا ہے، کیا ان ممالک میں قربانی والے جانور ناپید ہو چکے ہیں یا پہلے سے بھی زیادہ موجود ہیں؟! آپ کبھی اور کہیں سے بھی یہ نہیں سنیں گے کہ دنیا سے حلال جانور ختم ہو گئے ہیں یا اتنے کم ہو گئے ہیں کہ لوگوں کو قربانی کرنے کے لیے جانور ہی میسر نہیں آئے، جبکہ اس کے برخلاف کتے اور بلیوں کو دیکھ لیں، ان کی نسل ممالک میں کتنی ہے؟! حالاں کہ تعجب والی بات یہ ہے کہ کتے اور بلیاں ایک ایک حمل سے چار چار پانچ پانچ بچے جنتے ہیں، لیکن ان کی تعداد حلال جانوروں کے مقابلہ میں بہت کم نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ قرآن پاک کی آیت: ’’**وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَیْئٍ فَھُوَ یُخْلِفُہٗ**‘‘ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ’’اس آیت کے لفظی معنی یہ ہیں کہ تم جو چیز بھی خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے تمہیں اس کا بدل دے دیتے ہیں، کبھی دنیا میں اور کبھی آخرت میں اور کبھی دونوں میں۔ کائناتِ عالَم کی تمام چیزوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے، انسان اور جانور اس کو بے دھڑک خرچ کرتے ہیں، کھیتوں اور درختوں کو سیراب کرتے ہیں، وہ پانی ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا اس کی جگہ اور نازل ہو جاتا ہے، اسی طرح زمین سے کنواں کھود کر جو پانی نکالا جاتا ہے، اس کو جتنا نکال

کرخرچ کرتے ہیں اس کی جگہ دوسرا پانی قدرت کی طرف سے جمع ہوجاتا ہے۔ انسان غذا کھا کر بظاہر ختم کرلیتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسری غذا مہیا کردیتے ہیں۔ بدن کی نقل وحرکت اور محنت سے جو اجزاء تحلیل ہو جاتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے اجزاء بدل بن جاتے ہیں۔ غرض انسان دنیا میں جو چیز خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عام عادت یہ ہے کہ اس کے قائم مقام اس جیسی دوسری چیز دے دیتے ہیں۔ کبھی سزا دینے کے لیے یا کسی دوسری تکوینی مصلحت سے اس کے خلاف ہوجانا اس ضابطۂ الٰہیہ کے منافی نہیں۔ اس آیت کے اشارہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اشیا صرف انسان اور حیوانات کے لیے پیدا فرمائی ہیں، جب تک وہ خرچ ہوتی رہتی ہیں، ان کا بدل منجانب اللہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ جس چیز کا خرچ زیادہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی پیداوار بھی بڑھا دیتے ہیں۔ جانوروں میں بکرے اور گائے کا سب سے زیادہ خرچ ہوتا ہے کہ ان کو ذبح کر کے گوشت کھایا جاتا ہے اور شرعی قربانیوں اور کفارات وجنایات میں ان کو ذبح کیا جاتا ہے، وہ جتنے زیادہ کام آتے ہیں، اللہ تعالیٰ اتنی ہی زیادہ اس کی پیداوار بڑھا دیتے ہیں، جس کا ہر جگہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ بکروں کی تعداد ہر وقت چھری کے نیچے رہنے کے باوجود دنیا میں زیادہ ہے، کتے بلی کی تعداد اتنی نہیں، حالانکہ کتے بلی کی نسل بظاہر زیادہ ہونی چاہیے کہ وہ ایک ہی پیٹ سے چار پانچ بچے تک پیدا کرتے ہیں، گائے بکری زیادہ سے زیادہ دو بچے دیتی ہے، گائے بکری ہر وقت ذبح ہوتی ہے، کتے بلی کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، مگر پھر بھی یہ مشاہدہ ناقابلِ انکار ہے کہ دنیا میں گائے اور بکروں کی تعداد بنسبت کتے بلی کے زیادہ ہے۔ جب سے ہندوستان میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگی ہے، اس وقت سے وہاں گائے کی پیداوار گھٹ گئی ہے، ورنہ ہر بستی اور ہر گھر گایوں سے بھرا ہوتا جو ذبح نہ ہونے کے سبب بچی رہیں۔ عرب نے جب سے سواری اور بار برداری میں اونٹوں سے کام لینا کم کردیا، وہاں اونٹوں کی پیداوار بھی گھٹ گئی، اس سے اس ملحدانہ شبہ کا ازالہ ہوگیا، جو احکامِ قربانی کے مقابلہ میں اقتصادی اور معاشی تنگی کا اندیشہ پیش کر کے کیا جاتا ہے۔'' (معارف القرآن، سورۃ السبأ: ۳۹، ج: ۷، ص: ۳۰۳)

رفاہی کاموں کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے

ہماری اس بحث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رفاہِ عامہ کے مفید کاموں، ہسپتالوں کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے غریب ومساکین اور ناداروں پر خرچ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہمارا مقصود محض یہ ہے کہ دس ذوالحجہ سے لے کر بارہ ذوالحجہ کی شام تک جس شخص پر قربانی کرنا واجب ہے، اس کے لیے قربانی چھوڑ کر اس رقم کا صدقہ کرنا جائز نہیں ہے، ہاں! جس شخص پر قربانی کرنا واجب نہیں ہے، اس کے لیے ان دنوں میں یا صاحبِ نصاب لوگوں کے ان دنوں میں قربانی کرنے کے ساتھ ساتھ یا سال کے دیگر ایام میں مالی صدقہ کرنا یقیناً بہت زیادہ ثواب کی چیز ہے۔ رفاہِ عامہ کے مفید کاموں، ہسپتالوں کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے خرچ کرنے کے لیے اسلام نے زکاۃ، صدقۃ الفطر، عشر، کفارات، نذور، میراث، دیگر وجوبی صدقات اور ہدایا وغیرہ کا نظام وضع کیا ہوا ہے، ان احکامات کو پوری طرح عملی جامہ

پہنا کر مطلوبہ نتائج ومقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں، نہ یہ کہ اسلام کے ایک عظیم الشان حکم کو مسخ کر کے تلبیس سے کام لیا جائے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ معاشرے میں ہونے والی خرافات پر تفصیلی نظر ڈالی جائے، طرح طرح کی مروج رسومات میں ضائع ہونے والے اربوں وکھربوں کی مالیت کے روپے کو کنٹرول کیا جائے، نہ کہ ایک فریضے میں صرف کرنے والوں لوگوں کو بھی بہکا کر اس سے روک دیا جائے۔

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''منکرینِ قربانی نے اپنی عقلِ نارسا سے کام لیتے ہوئے بزعمِ خود قربانی کے مضرات اور نقصانات اور ترکِ قربانی کے فوائد بیان کیے ہیں، مثلاً: یہ کہا ہے کہ قربانی کی وجہ سے جانوروں کی نسل کُشی ہوتی ہے اور لوگوں کی رقمیں بلاوجہ ضائع ہوتی ہیں، اگر یہ رقوم رفاہِ عامہ کے کسی مفید کام میں صَرف کی جائیں تو کیا ہی اچھا ہو، وغیرہ وغیرہ، مگر یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو (جو حکیم علی الاطلاق ہے اور اس کا کوئی حکم عقل کے خلاف اور خالی از حکمت نہیں ہوتا) محض ان طفل تسلیوں سے کیوں کر رد کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس کو قربانی کا حکم دیتے وقت یہ معلوم نہ تھا کہ قربانی سے جانوروں کی نسل کشی ہوتی ہے اور اس کے یہ نقصانات ہیں؟ رب تعالیٰ کے صریح احکام میں معاذ اللہ کیڑے نکالنا کون سا ایمان ہے؟! اور پھر جناب خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح اور صریح قولی فعل اور اُمتِ مسلمہ کے عمل کو جو تواتر سے ثابت ہوا ہے، خلافِ عقل یا مضر بتانا کون سا دین ہے؟!''۔ (مسئلہ قربانی مع رسالہ سیف یزدانی، ص:۱۲)

حضرت مولانا مفتی محمد رضوان صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں: ''بعض لوگ روحانیت سے غافل ہو کر یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ قوم کا اتنا روپیہ جو تین دن میں جانوروں کے ذبح پر ہر سال خرچ ہو جاتا ہے اور اس کا خاطر خواہ مفاد نظر نہیں آتا، اگر یہی پیسہ رفاہی اور قومی مفادات پر لگایا جائے تو بہت فائدہ ہو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قربانی کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم اور اہم عبادت ہے، جیسے: حج کرنا، زکاۃ دینا، اور دوسری عبادات۔ تو کیا ان عبادات کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ یہ فضول خرچی اور مال کو بے جا خرچ کرنا ہے؟! اس طرح تو دین کا بہت بڑا حصہ اور بہت سے دینی احکام ہی کا اسلام سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ پس جب شریعت میں قربانی کا حکم ہے تو اسے عقلی اعتراضوں اور ذہنی ڈھکوسلوں کا شکار بنانا کسی طرح درست نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ دنیا میں ہونے والی دوسری اور اصل فضول خرچیاں (جن کا شریعت نے حکم بھی نہیں دیا) ان لوگوں کو نظر نہیں آتیں، جبکہ اصل میں تو ان کے ختم کرنے اور مٹانے کی ضرورت ہے، ملک کی کتنی بڑی تعداد ایسی ہے جو سگریٹ نوشی، منشیات، کرکٹ، ہاکی اور دوسرے کھیل، جوئے بازی، گھوڑ دوڑ، ناچ گانا، فحش پروگرام، انٹرنیٹ، ٹی وی، کیبل، وی سی آر، سینما، فضول تصویر سازی اور مووی بازی اور دوسرے فحش میڈیائی پروگرام، فحش اخبار و رسائل اور دیگر ناول اور ڈائجسٹ، بسنت، عید کارڈ، شادی کارڈ، گانوں اور دیگر غلط پروگراموں کی آڈیو وویڈیو کیسٹیں اور سی ڈیز، ویڈیو گیمز، آتش بازی، شادی بیاہ، مرگ وموت اور غمی خوشی کی رسومات، مختلف فیشن، غیر شرعی بیوٹی پارلر وغیرہ کی زد میں ہے، جن کو چھوڑ ے

اور توبہ کیے بغیر دنیا وآخرت کی فلاح اور کامیابی ملنا مشکل ہے اور یہی پیسہ اگر قومی اور رفاہی مفادات پر خرچ کیا جائے تو بہت جلد ترقی حاصل کی جاسکتی ہے۔'' (ذوالحجہ اور قربانی کے مسائل واحکام، ص:۱۶۷)

ذبح کرنے پر ایک عامیانہ اعتراض اور اس پر حضرت تھانویؒ کا حکیمانہ جواب

منکرین اور ملحدین کی طرف سے ایک اعتراض یہ بھی سامنے آتا ہے کہ زندہ جانوروں کے گلے پر چھری پھیر دینا بھی عقلِ سلیم کے خلاف ہے، یہ فعل مسلمانوں کی بے رحمی پر دلالت کرتا ہے، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے، اور ذبحِ حیوان رحم کے خلاف نہیں، بلکہ ان کے حق میں اپنی موت مرنے سے مذبوح ہوکر مرنا بہتر ہے، کیوں کہ خود مرنے میں قتل وذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو ذبح کردیا جایا کرے، تاکہ آسانی سے مرجایا کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حالتِ یأس سے پہلے ذبح کرنا تو دیدہ دانستہ قتل کرنا ہے اور حالتِ یأس پتہ نہیں چل سکتی، کیونکہ بعض لوگ ایسی بھی دیکھے گئے ہیں کہ مرنے کے قریب ہوگئے تھے، پھر اچھے ہوگئے۔ اور شبہ حیوانات میں کیا جائے کہ ان کی تو یأس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا۔ جواب یہ ہے کہ بہائم اور انسان میں فرق ہے، وہ یہ کہ انسان کا تو اِبقاء (باقی رکھنا) مقصود ہے، کیونکہ خلقِ عالم سے وہی مقصود ہے، اس لیے ملائکہ کے موجود ہوتے ہوئے اس کو پیدا کیا گیا، بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اس کو پیدا کیا گیا، کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہوا کرتا ہے، اس لیے انسان کے قتل اور ذبح کی اجازت نہیں دی گئی، ورنہ بہت سے لوگ ایسی حالت میں ذبح کردیئے جائیں گے، جس کے بعد ان کے تندرست ہونے کی امید تھی اور ذبح کرنے والوں کے نزدیک وہ یأس کی حالت میں تھا۔ اور جانور کا اِبقاء مقصود نہیں، اس لیے اس کے ذبح کی جازت اس بنا پر دے دی گئی کہ ذبح ہوجانے میں ان کو راحت ہے اور ذبح ہوجانے کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقائے انسانی میں مفید ہے، جس کا اِبقاء مقصود ہے، اس کو اگر ذبح نہ کیا جائے اور یونہی مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو وہ مردہ ہوکر اس کے گوشت میں سمّیت کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کے لیے مضر ہوگا، تو اِبقاء انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور قصاص، جہاد میں چونکہ افناءِ بعض افراد بغرضِ اِبقاء جمیع الناس متیقن ہے، اس لیے وہاں قتل انسانی کی اجازت دی گئی، مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی کہ حتیٰ الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے، یعنی: قصاص میں جو کہ قتلِ اختیاری ہے، تلوار سے۔ اور جہاد میں مثلہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔'' (اشرف الجواب، انیسواں اعتراض: ذبح کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب، ص:۸۶-۸۷، مکتبہ عمر فاروق، کراچی)

قربانی کی حقیقت کیا ہے؟

اگر قربانی کی حقیقت پر نظر ہو تو بھی یہ وسوسہ پیدا نہیں ہوسکتا، قربانی تو یادگار ہے حضرت ابراہیم علیہ

السلام کی کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنا بیٹا ذبح کرو، حالانکہ! دوسری طرف خود قرآن کا اعلان ہے کہ قتل کی سزا ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہے، نیز! بچوں کو تو جہاد کی حالت میں بھی قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، الغرض عقل کبھی بچے اور بالخصوص اپنے معصوم بچے کے قتل کو تسلیم نہیں کرسکتی، لیکن قربان جائیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر کہ انہوں نے اللہ سے یہ نہیں پوچھا کہ اے اللہ! جو بچہ مجھے برسہا برس دعائیں مانگنے کے بعد ملا، آخر اس کا قصور کیا ہے؟! اور اگر قصور ہے بھی تو اس کو مارنے سے کیا حاصل ہوگا؟! نہیں، اس لیے کہ جہاں اور جس کام میں اللہ کا حکم آجاتا ہے وہاں چوں چرا کی گنجائش نہیں رہتی، چاہے نفع نظر آئے یا نقصان۔

دوسری طرف قربانی کے جانور پر آنے والے اخراجات کا جائزہ لیجیے! آج کے اس مہنگائی کے دور میں بڑے جانور میں حصہ لینے کے لیے آٹھ یا نو ہزار روپے کافی ہیں اور اگر چھوٹا جانور لینا چاہیں تو بارہ سے پندرہ ہزار روپے میں کام چل جاتا ہے۔ اس جائزے کے بعد سوچیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں حکم ہو کہ تمہیں اختیار ہے کہ تم اپنا بیٹا قربانی کے لیے ذبح کرو، یا اس کی بجائے (بارہ سے پندرہ ہزار روپے کا) جانور ذبح کرو، تو بتلایئے کہ کون کس کو ترجیح دے گا؟ یقیناً بیٹے کے ذبح کے مقابلہ میں ہر عقل مند جانور ذبح کرنے کو ترجیح دے گا۔ اب ایک نظر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی ڈالیے کہ جب ان کو بیٹا ذبح کرنے کا حکم ملا (اور حکم بھی صراحۃً نہیں ملا، بلکہ خواب میں اشارۃً بتلایا گیا) تو انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی رُک کر یہ نہ پوچھا کہ یا باری عز وجل! اس میں میرے لیے کیا نفع ہے اور کیا نقصان؟! اور ایک ہم ہیں کہ معمولی سا جانور ذبح کرنے کا حکم دیا گیا اور ہم پوچھتے پھرتے ہیں کہ اس میں میرا کیا نفع ہے؟! اس کے بجائے یہ ہوجائے، وہ ہوجائے، وغیرہ، تو یہ قربانی کی روح کے خلاف ہے، یہ سوال کرنے والا درحقیقت قربانی کی حقیقت سے ہی ناواقف ہے، قربانی کے ذریعے تو یہ جذبہ پیدا کرنا مقصود ہے کہ جب اللہ رب العزت کی طرف سے کوئی حکم آجائے تو ہم اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے کی بجائے اللہ کے حکم کی پیروی کریں، اس کے حکم کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کریں، اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عمل میں اشارہ کیا ہے کہ ''فَلَمَّا أَسْلَمَا'' جب انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا.... الخ۔ تو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ قربانی محض رسم یا دل لگی نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعے ایک ذہنیت دینا مقصود ہے، جسے فلسفۂ قربانی کا نام دیا جاتا ہے، وہ یہی ہے کہ جب اللہ رب العزت کی طرف سے کوئی حکم آجائے تو ہم اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے کی بجائے اللہ کے حکم کی پیروی کریں، اس کے حکم کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کریں۔

سو ضرورت ہے کہ منکرینِ قربانی، ملحدین اور مستشرقین و کفار کے اس زہریلے پروپیگنڈے کے مقابلے میں اہلِ اسلام پُرزور طریقے سے اس حکم پر عمل پیرا ہوں، اسی میں اہلِ اسلام کی خیر و بقا کا راز اور دینِ اسلام کی حفاظت مضمر ہے۔ **أللّٰھم وفقنا لما تحب وترضٰی۔**

اسلام میں صنفِ نازک کی رعایت!

جناب عبداللہ صاحب

تاریخ شاہد ہے کہ غیر مسلم اقوام نے عورت پر جس قدر ظلم وستم روا رکھے ہیں، شاید اپنے معاشرے کی کسی اور صنف پر اتنے مظالم انہوں نے نہ ڈھائے ہوں اور اس ''عضوضعیف'' پر نزلہ گرانے کے لیے مختلف اقوام نے نت نئے طریقے ایجاد کیے ہیں: کہیں اُسے میراث سے محروم کیا گیا، کہیں اُسے اپنے شوہر کی چتا میں جلایا گیا، کہیں اُسے اس جرم بے گناہی میں اپنی زندگی بنانے سے روک دیا گیا کہ اس کا شوہر کیوں مرگیا تھا۔ کہیں اُسے سوسائٹی میں جانور سے بھی بدترین زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا کہ مرد تو اُس سے ہر طرح کا نفع اُٹھائے، ہر قسم کی خدمت لے، مگر جب اس کو حقوق دینے کی بات آئے اُسے اذیتیں پہنچائے۔ غرض اس طرح کے بے شمار ظلم وستم مختلف قوموں اور ملتوں نے ''صنف نازک'' پر ڈھائے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ جس قدر ہولناک، بھیانک اور انسانیت سوز مظالم مغربی تہذیب نے عورت پر ڈھائے ہیں، شاید اس سے پہلے کسی اور قوم اور ملت نے نہ ڈھائے ہوں۔ ان مظالم کا یہ پہلو اور بھی زیادہ المناک ہے کہ خود عورت کو اس کا احساس نہیں، وہ بے چاری یہ سمجھتی ہے کہ شاید میرے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔

یورپ میں اٹھارویں صدی وہ زمانہ ہے جس میں وہاں کی اکثریت کے دل سے خوفِ خدا کا آخری بیج بھی مارا جاچکا تھا۔ اس سے پہلے یورپ میں وہی فطری تقسیم کار تھی جو اسلام نے متعارف کرائی ہے کہ مرد کما کر لائے اور عورت گھر کا انتظام کرے۔ اس زمانے میں جاگیرداری نظام رائج تھا اور تمدن کا نیا ڈھانچہ وجود میں نہ آیا تھا، اس لیے زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ تھے، اور اس وقت معیارِ زندگی بھی سادہ تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت نہ تھی، اس لیے مرد نے اس تقسیم کار کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اٹھارویں صدی میں جب مشین ایجاد ہوئی تو یورپ کے اندر صنعتی انقلاب رونما ہوا جس نے اہل یورپ کی زندگی کے ہر شعبے پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ جاگیرداری نظام نے دم توڑ دیا

اور سرمایہ داری نظام نے اس کی جگہ لے لی، شہروں میں بڑے بڑے کارخانے کھلنے لگے اور دیہاتی آبادیاں جو جاگیرداروں کے ظلم وستم سے تنگ آ چکی تھیں، شہروں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئیں۔

اس پورے نظامِ معیشت کی تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ عام لوگوں کا معیارِ زندگی بھی بڑھنے لگا، ہر شخص کو سوسائٹی میں اپنا وقار باقی رکھنے کے لیے کافی سرمایہ کی ضرورت پیش آئی، چنانچہ پیسہ کمانے کی ہر ممکن کوشش کی جانے لگی، وقت کی رفتار کے ساتھ طرزِ بود وباش بدلتا رہا، ضروریاتِ زندگی بڑھتی ہی چلی گئیں، اس لیے حصولِ زر کی دوڑ شدید تر ہوتی گئی۔

ان حالات میں مغربی مرد کی خود غرض طبیعت جو ہمیشہ سے بغیر کوئی قربانی دیئے عورت سے نفع اٹھاتی چلی آئی تھی، برداشت نہ کر سکی۔ اس لیے کہ سرمایہ اس کی اپنی ضروریات کے لیے بمشکل مہیا ہوتا ہے، اس میں عورت کو بھی کہاں سے حصہ دار بنائے؟ اس کے لیے یا تو اپنی ضروریاتِ زندگی میں کمی کرے یا مزید پیسہ حاصل کرنے کے لیے اپنی جان پر اور بوجھ ڈالے۔

نظامِ معیشت اور طرزِ تمدن کے اس غیر معمولی انقلاب کے بعد مرد کو عورت کا گھر میں رہنا دو وجہ سے بری طرح کھٹکنے لگا: ایک تو وہ اس عورت سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتا تھا، صنعتی انقلاب کے بعد گھر سے دور دراز مصروفیتیں زیادہ تھیں، اس لیے جاگیردارانہ نظام کے برعکس اُسے گھر سے دور رہنا پڑتا۔ دوسرا معیارِ زندگی کے بلند ہونے کی وجہ سے اپنے مصارف کا برداشت کرنا ہی مشکل تھا، اس لیے اسے اپنے ساتھ ایک اور فرد کے لیے محنت ومشقت اٹھانا اپنے نفس پر ایک غیر ضروری بوجھ محسوس ہونے لگا، ان دونوں مشکلات کا حل اسے ایک ہی نظر آیا کہ اب کسی طرح عورت کو بھی کمانے پر آمادہ کرو، تاکہ حصولِ زر کی مشکلات بھی ختم ہوں اور عورت کے ہر قدم پر ساتھ رہنے سے اس نفسانی جذبے کی تسکین ہو جو رگ وپے میں پیوست ہو چکا ہے۔ یہ بات اگر سیدھے سادے انداز سے عورت سے کہی جاتی تو وہ مرد کی اس انسانیت سوز خود غرضی سے خبردار ہو جاتی کہ وہ ایک طرف تو ہر قدم پر عورت کے وجود سے اپنی جنسی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، دوسری طرف جب اسی عورت کے لیے روٹی کے چند ٹکڑے مہیا کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو اسے یہ کام دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ عورت یہ سوچتی کہ مرد کو اپنی جسمانی تکالیف کا تو اتنا احساس ہے کہ وہ ان کی وجہ سے عورت کو گھر سے نکالنا چاہتا ہے، مگر اسے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے یہ خیال بھی نہیں آتا کہ عورت جیسی صنف نازک روپیہ کمانے اور گھر کا انتظام کرنے کے دونوں کام کس طرح کرے گی؟ اپنی اس خود غرضی پر پردہ ڈالنے کے لیے مغربی مرد کی عیّاری نے جو ہمرنگِ زمیں جال تیار کیا، وہ اس قدر نظر فریب تھا کہ بے چاری عورت آج تک اس جال میں پھنسی ہونے کے باوجود اس کی دلفریبی میں مگن ہے، اسی نظر فریب جال کا دلکش اور معصوم نام ''تحریک نسواں'' ہے۔

مرد نے اپنی اسی خود غرضی پر عمل کرنے کے لیے آزاد خیالی کا سہارا لیا اور وہ لبرلسٹ جو عرصۂ دراز سے یورپ کی معاشی، اقتصادی، اخلاقی اور مذہبی زندگی میں انقلاب لانا چاہتے تھے، اس کام کے

لیے موزوں ترین ثابت ہوئے، چنانچہ اس مقصد کے لیے ’’عورتوں کی آزادی‘‘ کا نعرہ لگایا اور عام مطالبہ کیا کہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں محصور رکھنا اس پر ظلم ہے، مرتبہ ومقام کے لحاظ سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں، اُسے مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں حصہ لینا چاہیے، حصولِ معاش کے معاملہ میں اسے مرد کا محتاج ہونے کی بجائے مستقل بالذات ہونا چاہیے۔ چونکہ یہ نعرہ ہر اس مرد کی دلی آواز تھا جو نئے طرزِ زندگی کے بعد عورت کا گھر میں رہنا اپنی حرص وہوس کی وجہ سے برا سمجھ رہا تھا، چنانچہ لبرل پارٹی کی یہ آواز یورپ کے ہر خطہ سے اٹھنی شروع ہوگئی، بے چاری عورت مرد کی اس مکارانہ چال کو نہ سمجھ سکی اور اس نے بخوشی گھر کو خیر آباد کہہ کر مرد کی حرص وہوس کو نہایت اطمینان سے پورا کر دیا، پھر مرد نے اپنی چال سے اس صنف سے بڑے بڑے کام لیے۔ عورت جب بازاروں میں نکلی اور دفتروں میں داخل ہوئی تو مرد نے اپنی ہوسناک نگاہوں کی تسکین کے علاوہ اس کے ذریعہ اپنی تجارت بھی خوب چمکائی۔ دُکانوں اور ہوٹلوں کے کاؤنٹروں پر، دفتروں کی میزوں پر، اخبارات واشتہارات کے صفحات پر اس کے ایک ایک عضو کو سر بازار رُسوا کیا گیا اور گاہکوں کو اس کے ذریعہ دعوت دی گئی کہ آؤ! اور ہم سے مال خریدو، یہاں تک کہ وہ عورت جس کے سر پر فطرت نے عزت وآبرو کا تاج رکھا تھا اور جس کے گلے میں عفت وعصمت کے ہار ڈالے تھے، دُکان کی زینت بڑھانے کے لیے ایک شوکیس اور مرد کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے ایک تفریح کا سامان بن کر رہ گئی۔ اسی دوران عورت کو اسی حال پر خوش رکھنے اور اُسے تسلّی دینے کے لیے نت نئے افسانے گھڑے گئے جس سے عورت کو یہ محسوس ہوا کہ واقعی ہمارے مرد ہمارے بڑے ہمدرد ہیں اور ہمیں ظلم سے نجات دلانا چاہتے ہیں، چنانچہ اسے مساویانہ حقوق کے نام پر فطرت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا گیا، نتیجہ معلوم جو فطرت سے ٹکرائے گا، پاش پاش ہو جائے گا۔ آج اسی قسم کی عورت اپنا تشخص ڈھونڈ رہی ہے اور جہالت وضلالت کی تاریکیوں میں کبھی ایک دیوار سے سر ٹکرا رہی ہے تو کبھی دوسری دیوار سے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ مردوں نے عورتوں کو فطری حقوق نہیں دیئے یا نہیں بتائے اور اسے اس کا صحیح معاشرتی مقام نہیں بتایا۔

ہم آئندہ سطور میں عورت کی ان استثنائی صورتوں کا اجمالاً تذکرہ کریں گے جو اس کے متعلق اسلامی قوانین میں موجود ہیں اور وہ عورت کے فطری تشخص کے برقرار رکھنے کی واحد ضمانت ہیں:

۱:......منصب حکمرانی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ‘‘۔ (النساء:۳۴) ......’’مرد قوام (نگران) ہیں عورتوں پر‘‘۔

وضعی قوانین نے اس اصول کو مکمل طور پر غلط قرار دیا، مگر سو برس کے تجربہ نے بتایا کہ الٰہی قانون ہی اس معاملہ میں حقیقت سے قریب تر ہے۔ آزادیٔ نسواں کی تحریک کی تمام تر کامیابیوں کے

باوجود آج بھی ''مہذّب'' دنیا میں مرد ہی جنس برتر (Dominant Sex) کی حیثیت رکھتا ہے۔

آزادئ نسواں کے علم بردار یہ کہتے تھے کہ عورت اور مرد کا فرق محض سماجی حالات کی پیداوار ہے، مگر موجودہ زمانہ میں مختلف شعبوں میں اس مسئلہ کا جو گہرا مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صنفی فرق کے پیچھے حیاتیاتی عوامل (Biological Factores) کارفرما ہیں۔

ہارورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیروم گن کے مطالعہ نے اسے بتایا ہے کہ:

''مرد اور عورت میں بعض نفسیاتی فرق محض معاشرتی تجربات کی وجہ سے نہیں ہوسکتے، بلکہ وہ لطیف قسم کے حیاتیاتی فرق کی پیداوار ہیں۔''

کسریٰ کے مرنے کے بعد اس کے درباریوں نے اس کی لڑکی کو حکمران بنایا، آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''**لن یفلح قوم وَلَّوْا أمرَهم امرأة** ''۔ یعنی ''وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے اپنی حکمرانی عورت کو دے دی''۔

جدید تحقیق بھی اسلامی اصولوں کے مطابق ہے، چنانچہ ایک امریکی سرجن Edan Berman کا فیصلہ ہے کہ:

''عورتیں اپنی ہارمون کیمسٹری کی وجہ سے اقتدار کے منصب کے لیے جذباتی ثابت ہوسکتی ہیں''۔

عورت صنف نازک ہے، جبکہ مرد قوی۔ عورت میں انفعالیت ہے اور مرد میں فعالیت اور جارحیت، لہٰذا فطری طور پر عورتیں نازک مزاج اور جذباتی ہوتی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا ۱۹۸۴ء میں خواتین کی حالت (Status Of Women) پر ایک مفصل مقالہ ہے، اس مقالے کا ایک ذیلی عنوان یہ ہے: ''مرد اور عورت کے فرق کا سائنسی مطالعہ'' مقالہ نگار کے مطابق ''جدید تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان عین پیدائشی بناوٹ کے لحاظ سے فرق ہے''۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''اوصافِ شخصیت کے اعتبار سے مردوں کے اندر جارحیت اور غلبہ کی خصوصیات زیادہ پائی جاتی ہیں، ان میں حاصل کرنے کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں عورتیں سہارا چاہتی ہیں، ان کے اندر معاشرت پسندی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے اور ناکامی کی صورت میں مردوں کے مقابلہ میں وہ زیادہ آسانی سے بے ہمّت ہوجاتی ہیں۔ عورت کے اندر انفعالیت اور مرد میں فعّالیت زیادہ ہوتی ہے۔''

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الکسس کیرل (۱۸۷۳ء-۱۹۴۴ء) نے مذکورہ موضوع پر نہایت نفیس بحث کی ہے، وہ اس معاملہ کی حیاتیاتی تفصیلات پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''مرد اور عورت کے درمیان جو فرق پائے جاتے ہیں وہ محض جنسی اعضاء کی خاص شکل، رحم طور کی موجودگی، حمل یا طریقۂ تعلیم کی وجہ سے نہیں ہیں، وہ اس سے زیادہ بنیادی

نوعیت کے ہیں، وہ خود نسیجوں کے بناوٹ سے پیدا ہوتے ہیں اور پورے نظام جسمانی میں خصوصاً کیمیائی مادے کے سرایت کرنے سے ہوتے ہیں، جو کہ خصیۃ الرحم سے نکلتے ہیں۔ ان بنیادی حقیقتوں سے بے خبری نے ترقیٔ نسواں کے حامیوں کو اس عقیدہ تک پہنچایا ہے کہ دونوں صنفوں کے لیے ایک طرح کی تعلیم ایک طرح کے اختیارات اور ایک طرح کی ذمہ داریاں ہونی چاہئیں، باعتبار حقیقت عورت نہایت گہرے طور پر مرد سے مختلف ہے۔ عورت کے جسم کے ہر خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے، یہی بات اس کے اعضاء کے بارے میں بھی درست ہے اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کے بارے میں عضویاتی قوانین بھی اتنا ہی اٹل ہیں جتنا کہ فلکیاتی قوانین اٹل ہیں، ان کو انسانی خواہشوں سے بدلا نہیں جاسکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ان کو اسی طرح مانیں، جیسے کہ وہ ہیں۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خود اپنی فطرت کے مطابق ترقی دیں، وہ مردوں کی نقل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تہذیب کی ترقی میں ان کا حصہ اس سے زیادہ ہے جتنا کہ مردوں کا ہے، انہیں اپنے مخصوص عمل کو ہرگز چھوڑنا نہیں چاہیے‘‘۔

امریکی پروفیسر گولڈ برگ کہتے ہیں:

’’اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مرد عورتوں سے بہتر (Better) ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مرد عورتوں سے مختلف (Diffrent) ہوتے ہیں، مرد کا دماغ اس سے مختلف طرز پر کام کرتا ہے، جس طرح عورت کا دماغ کام کرتا ہے۔ کچھ عورتیں مستثنیٰ ہوسکتی ہیں، مگر وہ بہت معمولی اقلیت میں ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، رحم مادر سے لے کر سوچنے کی صلاحیت تک یہ فرق دونوں کی حیاتیاتی نوعیت کے فرق سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ کسی قسم کے سماجی حالات سے‘‘۔

امریکہ میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کافی طاقتور ہے، مگر اب اس کے حامی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی راہ کی اصل رکاوٹ سماج یا قانون نہیں، بلکہ خود فطرت ہے۔ فطری طور پر ہی ایسا ہے کہ عورت بعض حیاتیاتی محدودیت کا شکار ہے۔ میل ہارمون اور فی میل ہارمون کا فرق دونوں میں زندگی کے آغاز ہی سے موجود ہوتا ہے، چنانچہ تحریک آزادیٔ نسواں کے پرجوش حامی کہنے لگے ہیں کہ فطرت ظالم ہے، ہمیں چاہیے کہ پیدائشی سائنس ایوجنکس (cience Of Eufenics) کے ذریعہ جنیٹک کوڈ کو بدل دیں اور نئے قسم کے مرد اور نئی قسم کی عورتیں پیدا کریں۔ یہ ہے وہ آخری انجام جو امریکی عورت کے نعرہ ’’پالیسی بناؤ کافی نہ بناؤ‘‘ (Make Policy Not Coffee) کا دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک میں ہوا ہے۔ یہ واقعہ اس بات کا ایک تجرباتی قرینہ ہے کہ وضعی قوانین کے مقابلہ میں الٰہی قانون میں فطرت کی رعایت زیادہ پائی جاتی ہے۔

۲:......فطری تقسیم کار

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

’’لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المتشبّھین من الرجال بالنساء والمتشبّھات من النساء بالرجال‘‘۔ (مشکوٰۃ،ص:۳۸۰)

ترجمہ:’’رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے‘‘۔

انسانیت کو مرد وعورت کی صنفی تقسیم کے ساتھ پیدا کرنا براہِ راست خالق کی منصوبہ بندی ہے، اس تقسیم کو باقی رکھنے ہی میں انسانی زندگی کی ترقی ہے، جو مرد یا عورت اس تقسیم کو توڑنے کی کوشش کرے، وہ گویا نظامِ فطرت کو توڑتا ہے، نظامِ فطرت کو توڑنا صرف تخریب ہے، وہ کسی درجہ میں بھی تعمیری کام نہیں ہے، اسلام کے نزدیک مرد وعورت ایک دوسرے کے ہم سر (Duplicates) نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ (Complemen) ہیں اور دونوں میں ناقابل عبور قسم کے حیاتیاتی فرق پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق تقسیم کار کی حکمت پر مبنی ہے، وہ اس طرح کہ مرد کی کمی کی تلافی عورت اور عورت کی کمی کی تلافی مرد کرے۔

قرضوں کے معاملہ میں اسلام کے قانونِ شہادت میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے، قرآن میں قرض کے معاملہ کا قاعدہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:’’اپنے مردوں میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں، ایسے گواہوں میں جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دو عورتوں میں سے ایک اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلادے۔‘‘

چنانچہ حالیہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ قرآن کا یہ قانون بالکل فطری ہے، کیونکہ وہ حیاتیاتی حقیقت کے عین مطابق ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۸۵ء) میں یو.پی.آئی کے حوالہ سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے، یہ رپورٹ اخبار کے صفحہ نمبر:۹ پر ہے۔ اخبار لکھتا ہے:

ترجمہ:’’عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں، مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنسدان نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں، اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے، صنف قوی لسانی مواد کو ترکیب دینے اور استعمال کرنے میں زیادہ مشکل محسوس کرتا ہے‘‘۔

مذکورہ بالا آیت کا تعلق قرض سے ہے، یعنی وہ صورت جبکہ آج معاملہ کیا جائے اور آئندہ

اس کی ادائیگی ہو، ایسے معاملہ میں حکم دیا گیا ہے کہ اس کے اوپر دو مرد گواہ ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کیے جائیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں انصاف پسندی کے بعد دوسری چیز جو دیکھنے کی ہے، وہ یادداشت ہے اور جب حیاتیاتی طور پر عورت کی یادداشت مرد سے کم ہو تو یہ عین حقیقت کے مطابق ہے کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ بنائی جائیں، گویا مرد اور عورت میں گواہی کا فرق بر بنائے ضرورت ہے، نہ کہ بر بنائے فضیلت۔

قرآنی آیت: ''اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَافَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ'' میں فضیلت سے عمومی فضیلت مراد نہیں ہے، بلکہ یہ وہ نوعی فضیلت ہے جو ناگزیر حیاتیاتی فرق کی وجہ سے ہے، ورنہ مطلقاً بحیثیت انسان ہونے کے مرد کو عورت پر کوئی فضیلت نہیں ہے، بلکہ یہ فضیلت فطری صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد ہوئی ہیں اسی جہت سے ہے۔ جیسے پھلوں کے متعلق ارشاد ہے: ''وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْأُکُلِ''۔ (الرعد:۴) یہاں پر مفسرین نے تفضیل سے مراد فرق اور تنوع لیا ہے، نہ یہ کہ پھلوں میں سے کسی ایک پھل کو دوسرے پھل پر مطلق برتری حاصل ہے، یعنی ہر پھل میں ایک منفرد خصوصیت ہے جو دوسرے میں نہیں۔ ہر پھل میں رنگ اور مزہ کے اعتبار سے ایک مزید پہلو ہے جو دوسرے پھل سے مختلف ہے۔ عورت اور مرد میں بھی اسی طرح فرق رکھا گیا ہے۔ ایک صنف کے اندر ایک اضافی خصوصیت ہے تو دوسری صنف میں دوسری اضافی خصوصیت، اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ:

''وَلَاتَتَمَنَّوْا مَافَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ، لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ''۔ (النساء:۳۲)

یعنی ''جن چیزوں میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، ان میں ہوس نہ کرو۔ مردوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے۔''

یورپ میں فیملی سسٹم کی تباہی

سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گورباچوف نے ایک کتاب لکھی ہے ''پروسٹرائیکا'' یہ کتاب پوری دنیا میں مشہور ہے اور شائع شدہ شکل میں موجود ہے، اس کتاب میں گورباچوف نے عورتوں کے بارے میں ''Status Of Women'' کے نام سے ایک باب قائم کیا ہے، اس میں اس نے صاف اور واضح لفظوں میں یہ بات لکھی ہے کہ:

''ہماری یورپ کی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا، اس کو گھر سے نکالنے کے نتیجے میں بے شک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کیے اور پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا، اس لیے کہ مرد بھی کام کر رہے ہیں اور عورتیں بھی کام کر رہی ہیں، لیکن پیداوار کے زیادہ

ہونے کے باوجود اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہوگیا اور اس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجے میں ہمیں جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں، وہ نقصانات ان فوائد سے زیادہ ہیں جو پیداوار (پروڈکشن) کے اضافے کے نتیجے میں ہمیں حاصل ہوئے، لہٰذا میں اپنے ملک میں ''پروسٹرائیکا'' کے نام سے ایک تحریک شروع کررہا ہوں، اس میں میرا ایک بڑا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ عورت جو گھر سے باہر نکل چکی ہے، اس کو گھر میں واپس کیسے لایا جائے؟ اس کے طریقے سوچنے پڑیں گے، ورنہ جس طرح ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہوچکا ہے، اسی طرح ہماری پوری قوم تباہ ہوجائے گی''۔

نفع بخش کاروبار

ایک مرتبہ اس لیے سروے کیا گیا کہ معلوم کیا جائے کہ آج کل نفع بخش کاروبار کونسا ہے؟ چنانچہ رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار ''ماڈل گرل'' کا کاروبار ہے، اس لیے کہ ایک ''ماڈل گرل'' مصنوعات کے اشتہارات پر اپنی عریاں تصویر دینے کے لیے صرف ایک دن کے ۲۵ ملین ڈالر وصول کرتی ہے اور اس ایک دن میں وہ تاجر اور سرمایہ کار اپنی مرضی سے جتنی تصویریں جس انداز سے اور جس زاویے سے اتارنا چاہے، اُتارتا ہے اور اس کے ذریعہ وہ اپنی مصنوعات کو بازار میں پھیلاتا ہے، آج یہ عورت ایک بکاؤ مال بن چکا ہے اور سرمایہ دار اُس کو جس طرح چاہتا ہے، استعمال کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عورت نے گھر سے باہر نکل کر اپنی قدر ومنزلت اور اپنا مرتبہ کھودیا اور اس کا یہی نتیجہ برآمد ہوا۔

چند اصولی باتیں

۱:...... وضعی قانون کوئی قابل قبول اصول وقانون دریافت کرنے میں ناکام رہا ہے اور وہ آئندہ بھی ناکام ہی رہے گا، کیونکہ انسان کی محدودیت یہاں راہ میں حائل ہورہی ہے۔

۲:...... وہ واقعہ جس نے انسان کے لیے اصول وقانون کی دریافت کو ناممکن بنادیا ہے، اسی میں الٰہی قانون کی صداقت کا قرینہ چھپا ہوا ہے، کیونکہ ایک طرف انسانی ذہن کی محدودیت اور دوسری طرف حقائق کی وسعت ظاہر کررہی ہے کہ کوئی ایسا ذہن ہو جو انسانی ذہن سے برتر ہو اور جس کے اندر سارے حقائق موجود ہوں۔ کائنات میں ایسے واقعات ہیں جو فطرت اور جبلّت کی سطح پر الہام کا امکان ثابت کررہے ہیں۔ الٰہی قانون اس میں صرف یہ اضافہ کرتا ہے کہ اس الہام کو انسان تک وسیع کردیتا ہے۔ یہ واقعہ اس مفروضہ کی مزید تائید کرتا ہے کہ موجودہ الٰہی قانون میں کچھ ایسی برتر امتیازی خصوصیات ہیں جو اسی وقت قابل فہم ہوسکتی ہیں، جب کہ یہ مانا جائے کہ وہ ایسے ذہن سے نکلا ہے جو انسان کے مقابلہ میں زیادہ وسیع طور پر حقائق کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تدریسی منہج کے اصول

مولانا سعید الحق جدون

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ امت کے ان عظیم محسنوں میں سے ہیں جن کی محنت سے آج بھی امت مسلمہ فائدہ اٹھارہی ہے۔ آپ کا پورا نام محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ جعفی بخاری، کنیت ابوعبداللہ اور لقب بخاری ہے۔ ۱۳؍شوال ۱۹۴ھ کو بخارا میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ میں فوت ہوئے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بلا کا حافظہ اور علم میں ملکۂ تامہ عطا فرمایا تھا۔ مطالعہ آپ کے دل و دماغ کی غذا تھی، درس و تدریس آپ کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی، علمی مشاغل آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، پوری عمر حدیث پڑھی اور پڑھائی، حدیث لکھی اور لکھوائی۔ احادیث میں انتہائی مہارت کی بنا پر اس فن کے امام جانے جاتے ہیں۔

جو ہستی احادیث کی تدریس میں امامت کے بلند درجہ پر فائز ہو، عظیم محدث، بلند پایہ مربی واتالیق اور منجھے ہوئے استاذ بلکہ استاذ الاساتذہ ہو، اس کے تدریسی تجربات تعلیمی میدان میں ایسی حیثیت رکھتے ہیں، جیسے ادب میں ضرب الامثال۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسے مثالی استاذ کے تدریسی اصول و قواعد تعلیمی میدان میں معلمین اور متعلمین کے لیے قابل تقلید نمونے ہیں۔

اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ ہم امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسے مثالی استاذ کے تدریسی منہج اور اصول کو ذکر کریں، تاکہ دینی وعصری تعلیمی اداروں کے اساتذہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تدریسی منہج اور اصول وقواعد سے باخبر ہوں اور ان اصولوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے تدریسی اسلوب کو بہتر سے بہتر بنا کر طلبہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکیں۔ اس مضمون سے طلبہ کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ جان لیں گے کہ وہ استاذ کی تدریس سے کس طرح بہتر انداز میں مستفید ہوسکیں گے، اس لیے اس مقالے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق کتاب ''صحیح بخاری'' میں ''کتاب العلم'' سے ان کے تدریسی منہج کے اصول وقواعد پیش کیے جاتے ہیں:

درس سے پہلے طلبہ کے علمی شوق کو ابھارنا

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تعلیمی نظریات کے مطابق معلم سب سے پہلے شاگردوں کو سبق کی طرف

راغب کرے گا، ان کے علمی شوق کو مختلف فضائل اور سابقہ علمی واقفیت سے ابھارے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے باب باندھا ہے: ''**باب فضل العلم**''(۱) اس باب کے انعقاد سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غرض یہ ہے کہ معلمین اور متعلمین میں علمی شوق اور علمی رغبت پیدا ہو۔

درس کے درمیان سوال نہ پوچھنا

استاذ سے درس کے دوران اگر کوئی شاگرد سوال پوچھے تو معلم اپنے درس کو پورا کرنے کے بعد جواب دے۔ درس کے دوران سوال کرنا آدابِ گفتگو کے خلاف ہے۔ شاگرد کو سبق کے دوران سوال نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کسی شاگرد نے دورانِ درس غلطی سے کچھ پوچھ لیا اور استاذ نے جواب نہ دیا تو یہ قابل ملامت بات نہ ہوگی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے اثبات کے لیے حدیثِ اعرابی کو بطورِ استدلال پیش کیا ہے۔ اعرابی نے بیان کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان ختم ہونے کے بعد سائل کے سوال کا جواب دیا۔ یہاں یہ قید ملحوظ رہے کہ وہ سوال کچھ اہم اور ضروری نوعیت کا نہ ہو، اگر ایسا ہو تو فوراً سوال کرنے کی گنجائش ہے اور معلم کو فوری طور پر جواب دینا چاہیے۔(۲) جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطبے کے دوران ایک دیہاتی نے سوالات کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر سے نیچے اترے، اس دیہاتی کو جوابات دیئے اور بعد میں خطبہ مکمل کیا۔(۳)

سائل کو نہ جھڑکنا

مذکورہ حدیثِ اعرابی اور ترجمۃ الباب سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ ادب سکھلا رہے ہیں کہ اگر استاذ کے اشتغال کے وقت ان سے سوال کیا جائے تو سائل کو ڈانٹنے اور جھڑکنے کی ضرورت نہیں۔(۴)

طلبہ کے استفسار پر ناراض نہ ہونا

حدیثِ اعرابی میں سائل امانت کے ضائع ہونے کا مطلب نہ سمجھ سکا، اس نے کہا ''**کیف اضاعتھا؟**''(۵) اس سے معلوم ہوا کہ اگر متعلم کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے تو وہ استاذ سے استفسار کرسکتا ہے اور اس کے استفسار پر معلم کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ اگر سوال کا مقصد استاذ کا امتحان لینا یا اس کو پریشان کرنا ہو تو پھر استاذ کی ناراضگی بجا ہے۔(۶)

بلند آواز سے درس دینا

معلم کو بلند آواز سے درس دینا چاہیے۔ بعض اوقات اساتذہ دھیمی آواز سے درس دیتے ہیں، جس کی وجہ سے طلبہ کو سننے میں دقت پیش آتی ہے یا سرے سے طلبہ سبق سن ہی نہیں سکتے۔ اس بات کی تائید کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی، وہ فرماتے ہیں کہ: ''ہم ایک

www.banuri.edu.pk

سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، نماز کا وقت ہونے کی وجہ سے ہم جلدی جلدی وضو کررہے تھے، ہم گیلا ہاتھ پاؤں پر پھیرنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا: ''ایڑیوں کے لیے آگ کی وعید ہے'' دو مرتبہ یا تین مرتبہ یہ فرمایا۔ (۷) گویا اس حدیث سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اساتذہ کو ادب بتلا رہے ہیں کہ علمی بات بلند آواز سے بیان کی جائے، تاکہ سب لوگ سن سکیں۔ (۸)

تدریس کو دلچسپ بنانا

تدریس کو دلچسپ بنانا چاہیے، اساتذہ اگر تشحیذِ اذہان کے طور پر طلبہ کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (۹) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمل پیش کیا ہے جس کی روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کی ہے: ''فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے خزاں میں نہیں جھڑتے، وہ درخت مومن کی طرح ہے، مجھے یہ بتایئے کہ وہ کونسا درخت ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دھیان جنگلی درختوں کی طرف گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے، لیکن مجھے شرم آئی کہ بڑوں کے سامنے کچھ کہوں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہی فرمائیں کہ وہ کون سا درخت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ کھجور کا درخت ہے''۔ (۱۰) اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ تدریس کو دلچسپ بنانے کے لیے بعض اوقات موقع کی مناسبت سے مثال دینا اور کبھی کبھار طلبہ سے پوچھنا چاہیے۔

طلبہ کی علمی آزمائش کرنا

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان سے باب قائم کیا ہے: ''**باب طرح الإمام المسئلة على أصحابه ليختبر ماعندهم من العلم**''۔ (۱۱)

یعنی ایک استاذ اپنے رفقا کی علمی آزمائش کے لیے کوئی سوال کرے۔ اس عنوان کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وہی مذکورہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی کھجور والی روایت بطور استدلال پیش کی ہے۔ گویا یہ حدیث مکرر ہے، مگر عنوان الگ الگ ہے اور سند بھی جدا ہے۔ پہلے باب میں تدریس کو دلچسپ بنانے کے لیے بطور مثال اس حدیث کو پیش کیا گیا، جب کہ اس باب میں طلبہ کی ذہنی صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ حدیث دوبارہ لائی گئی ہے۔ ترجمۃ الباب سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ ہے کہ استاد کو چاہیے کہ کبھی کبھی طلبہ کا امتحان لے، تاکہ استاد کو کلاس میں طلبہ کے علمی معیار کا اندازہ ہوسکے، اساتذہ کا اپنے شاگردوں سے سوالات کرنا بہتر ہے، تاکہ تلامذہ بیدار رہیں اور غفلت میں وقت ضائع نہ کریں۔ (۱۲)

تدریس کے طریقے

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تدریس کے دو طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ایک یہ کہ استاد درس

دے اور شاگرد سنے اور دوسرا یہ کہ شاگرد عبارت پڑھے اور استاد سنے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض محدثین نے عالم کے سامنے قراءۃ پر ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں!'' تو یہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھنا ہے۔ اور ضمام رضی اللہ عنہ نے اس بات کی اپنی قوم کو اطلاع دی اور ان کی قوم نے اس خبر کو کافی سمجھا۔ (۱۳)

کلاس روم کے آداب

''باب من قعد حیث ینتھی بہ المجلس ''(۱۴) میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کلاس روم کے دو آداب بتلا رہے ہیں: ایک یہ کہ اگر کلاس روم میں طلبہ زیادہ ہوں تو بعد میں آنے والے طلبہ کو جہاں جگہ ملے، وہیں بیٹھ جائیں اور اگر قریب بیٹھنے کی خواہش ہو تو پہلے آیا کریں۔ دوسرا یہ کہ اگر پہلے بیٹھنے والے اس طرح بیٹھے ہوں کہ اگلی صف میں یا بیچ میں جگہ خالی چھوڑ دی ہو تو بعد میں آنے والا انہیں پھاند کر آگے جاسکتا ہے، اگرچہ تخطی رقاب سے منع کیا گیا ہے، تاہم یہ اس لیے جائز ہے کہ پہلے سے بیٹھنے والوں نے ہی خود بے تمیزی کی کہ آگے جگہ خالی چھوڑ دی۔ (۱۵)

اپنے سے کم سے علم حاصل کرنا

''باب قول النبیؐ رب مبلغ أوعیٰ من سامع ''(۱۶) سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ تنبیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم بڑا فہیم و ذکی ہو اور استاد اس جیسا ہوشیار نہ ہو تو اس کو اس استاد سے حصولِ علم میں اعراض نہیں کرنا چاہیے کہ میں تو اتنا فہیم ہوں، بھلا میں اس سے علم حاصل کروں؟ ایسا ہرگز نہ کریں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''رب مبلغ أوعیٰ من سامع'' بسا اوقات وہ جسے حدیث پہنچائی جائے' براہ راست سننے والے سے زیادہ حدیث کو یاد رکھتا ہے۔ (۱۷) اس باب میں یہ ترغیب دینا ہے کہ اپنے سے کم سے بھی علم حاصل کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

بلا امتیاز ہر کسی کو پڑھانا چاہیے

''رب مبلغٍ أوعیٰ من سامع '' سے ایک بات یہ بھی معلوم ہو رہی ہے کہ معلم کسی کو پڑھانے سے انکار نہ کرے، ہر کسی کو پڑھائے، کیا معلوم کون زیادہ سمجھنے والا ہے۔ بعض اوقات شاگرد سمجھ بوجھ کے لحاظ سے اپنے استاد سے آگے نکل جاتا ہے اور وہ اس سبق سے ایسے فوائد اور معلومات کا ادراک کرلیتا ہے جو استاد نہیں کرسکتا۔ تو ''رب مبلغٍ'' میں اس طرف اشارہ ہے۔

www.banuri.edu.pk

درس وتدریس کے بغیر محض مطالعہ سے علم حاصل نہیں ہوتا

ترجمۃ الباب کے تحت فرمان نبویؐ ''إنما العلم بالتعلم''[۱۸] سے یہ بات معلوم ہوئی کہ علم تعلّم سے حاصل ہوگا، محض مطالعہ سے کوئی عالم نہیں بن سکتا۔ استاد سے باضابطہ تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ یہ بالکل دھوکہ ہے کہ صرف کتب وشروح دیکھ کر استاد سے پڑھے بغیر علم حاصل ہوسکتا ہے۔[۱۹] اس حدیث کی بنا پر فقہا نے لکھا ہے کہ جو آدمی ماہر اربابِ فتویٰ سے تربیت مکمل کیے بغیر صرف کتابیں دیکھ کر فتوے دے، اس کی بات کا اعتبار نہیں کرنا۔[۲۰]

تدریس میں تدریجی طریقہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے تحت علماء ربانیین کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

''ویقال الربانی الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارہ''۔[۲۱]

''ربانی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بڑے مسائل سے پہلے چھوٹے مسائل سمجھا کر لوگوں کی علمی تربیت کرے''۔

گویا ان الفاظ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تدریسی منہج کے وہ اصول معلوم ہورہے ہیں کہ تدریس میں اجمال سے تفصیل، آسان سے مشکل اور کم سے زیادہ کی طرف آہستہ آہستہ سکھایا جائے۔ تدریس میں اہم بات یہ ہے کہ استاد اپنے شاگردوں کو علم کے پیچیدہ مسائل میں شروع سے نہ الجھائیں کہ وہ اُنہیں میں پھنس کر رہ جائیں، بلکہ آسان چیزیں پہلے ہی سکھا دیں، تاکہ شاگردوں کے اندر علم سے محبت بڑھے اور ان کے حوصلے میں اضافہ ہو۔[۲۲]

تدریس میں طلبہ کی نفسیات کو مدنظر رکھنا

ایک معلم کو طلبہ کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے سبق پڑھانا ضروری ہے، تدریس میں نہ اتنی طوالت ہو کہ طلبہ میں بوریت پیدا ہو اور نہ اتنا اختصار ہو کہ غبی طلبہ سمجھ نہ سکیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے باب قائم کیا ہے: ''ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولھم بالموعظۃ والعلم کی لاینفروا''۔[۲۳] یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے کبھی کبھی نصیحت فرماتے اور تعلیم دیتے، تاکہ ان کو ناگوار نہ گزرے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آسانی کرو اور سختی نہ کرو اور خوش کرو اور نفرت نہ دلاؤ''۔[۲۴] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کچھ دن نصیحت فرمانے کے لیے مقرر کردیتے تھے، ہمارے پریشان ہوجانے کے خیال سے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہرروز نصیحت نہ فرماتے''۔[۲۵]

تدریس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ استاد سبق پڑھاتے وقت کچھ لطیفے یا اشعار وغیرہ بھی سنا دیا کرے، اس طرح ذہن تروتازہ ہوجاتا ہے اور طلبہ بیزاری اور اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مزاح فرمایا کرتے تھے۔ (۲۶)

تدریس میں طلبہ کی گروہ بندی کرنا

’’فهم في العلم‘‘ (۲۷) سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ لوگ فہم فی العلم میں مختلف ہوتے ہیں، کوئی ذہین تو کوئی متوسط اور غبی، لہٰذا استاد کو سب کی رعایت کرنی چاہیے، ایک اچھے معلم کی یہ خوبی ہے کہ وہ ان تین قسموں میں گروہ بندی کرے اور ہر ایک گروہ کو علیحدہ علیحدہ پڑھائے، یا ایک لیکچر دے، لیکن ان میں سے ان تینوں قسم کے طلبہ کے معیار کا خیال رکھا جائے۔

تعلیم بالغاں

’’تفقهوا قبل أن تسودوا‘‘ سردار بنائے جانے سے پہلے تفقہ حاصل کرو یا یہ سواد لحیہ سے ماخوذ ہے، یعنی بالوں کی سفیدی سے پہلے علم حاصل کرو۔ (۲۸) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سیادت کے بعد علم نہ حاصل کیا جائے۔ ’’**وقد تعلم أصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم في كبر سنهم**‘‘۔ (۲۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے کبرسنی میں تعلیم حاصل کی ہے، لہٰذا ادھیڑ عمر والوں کے لیے ان کی کبرسنی علم حاصل کرنے سے مانع نہیں، ان کو بھی پڑھنا چاہیے۔

طلبہ کے درمیان مناظرہ کا اہتمام کرنا

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قصۂ خضر وموسیٰ علیہما السلام میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حر بن قیس کا مناظرہ ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حر بن قیس کے مقابلہ میں جیت گئے۔ (۳۰) اس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تدریسی منہج کے یہ اصول مستنبط ہورہے ہیں کہ استاد بعض اوقات طلبہ کے درمیان کلاس روم میں کسی موضوع پر مباحثہ کرائے، تاکہ طلبہ کی دلچسپی پیدا ہوجائے اور سبق سننے کے لیے بیدار ہوجائیں۔

لیکچر دیتے وقت مثال دے کر طلبہ کو سمجھانا

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ’’باب من عَلِمَ و عَلَّمَ‘‘ (۳۱) میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ نے مجھے اِس علم وہدایت کے ساتھ بھیجا ہے، اس کی مثال زبردست بارش کی سی ہے جو زمین پر خوب برسے، بعض زمین جو صاف ہوتی ہے وہ پانی کو پی لیتی ہے اور بہت سبزہ اور گھاس اُگاتی ہے اور بعض زمین جو سخت ہوتی ہے وہ پانی کو روک لیتی ہے، اس سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، وہ اس سے سیراب ہوتے ہیں اور سیراب کرتے ہیں اور کچھ زمین کے خطوں پر پانی پڑا، وہ بالکل

www.banuri.edu.pk

چٹیل میدان ہی تھے، نہ پانی کو روکتے ہیں اور نہ سبزہ اُگاتے ہیں۔ تو یہ مثال ہے اس شخص کی جو دین میں سمجھ پیدا کرے اور نفع دے اس کو وہ چیز جس کے ساتھ میں مبعوث کیا گیا ہوں، جس نے علم دین سیکھا اور سکھایا اور اس شخص کی مثال جس نے سرنہیں اٹھایا، جو ہدایت دے کر میں بھیجا گیا ہوں اسے قبول نہیں کیا۔ (۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو علم وحکمت عطا فرمائی، اس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی اچھی مثال سے واضح فرمایا کہ: تین طبقے ہیں، ایک طبقہ ایسا ہے جس نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے خود تو فائدہ نہیں اٹھایا، مگر دوسرے اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں بہرحال بہتر ہیں، پہلی کو دوسری پر فضیلت حاصل ہے۔ تیسری جماعت وہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر کان ہی نہ دھرا، یہ سب سے بدتر جماعت ہے۔ (۳۳)

اس روایت سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تدریسی طریقہ کار کا اندازہ ہوتا ہے کہ لیکچر دیتے وقت طلبہ کو سمجھانے کے لیے مثال دینا چاہیے، جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھانے کے لیے مثال دیتے تھے، کیونکہ بعض اوقات ایک مثال ہزار الفاظ سے بہتر ہوتی ہے۔

طلبہ کو ہوم ورک دینا

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ معلم فقط پڑھانے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ اسباق کو طلبہ سے یاد بھی کرائے اور دوسروں تک منتقل کرنے کی ترغیب بھی دے، تاکہ تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رہ سکے۔ اہل علم اور مدرسین کو چاہیے کہ متعلم کو اسباق یاد کرنے اور ان اسباق کی تبلیغ کرنے کی تاکید میں قصور نہ کریں۔ (۳۴)

تعلیم وتربیت کے لیے استاد بعض اوقات اظہار غضب کرسکتا ہے

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے: ''باب الغضب فی الموعظة والتعلیم'' (۳۵) اس باب سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ ہے کہ ''یسروا ولا تعسروا'' اور ان جیسی روایات کو دیکھ کر یہ نہ سمجھنا کہ تعلیم وتدریس میں غضب کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ بعض مواقع میں غضب اور شدت نہ صرف جائز ہے، بلکہ مستحسن ہے۔ (۳۶)

تدریس میں اعتدال پسندی

تدریس میں اعتدال سے کام لینا چاہیے، تدریس جب طویل ہو تو طلبہ میں تھکان اور بوریت پیدا ہو جاتی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: ''أیها الناس إنکم منفرون فمن صلی بالناس فلیخفف'' (۳۷)....... ''اے لوگو! تم لوگ نفرت پھیلاتے ہو، جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے، وہ تخفیف کرے۔'' اس جملے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ استاد اتنا طویل لیکچر نہ دے جس سے طلبہ میں نفرت پیدا ہو۔

کلاس میں بیمار اور حاجت مند طلبہ کا خیال رکھنا

اس غرض کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ ''کتاب الصلوٰۃ'' والی روایت ''کتاب العلم'' میں لائی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام کو طویل نماز سے بچنے کی تنبیہ ان الفاظ میں فرما رہے ہیں: ''**فإن فیھم المریض والضعیف وذا الحاجة**''۔ (۳۸) ....''اس لیے کہ ان نمازیوں میں بیمار، کمزور اور حاجت مند لوگ ہیں''۔ ''**کتاب العلم**'' میں اس روایت سے ہم یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ کلاس روم میں استاد کو چاہیے کہ وہ بیمار، کمزور اور حاجت مند طلبہ کا خیال رکھے۔

رُک رُک کر درس دینا

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا تدریسی منہج یہ ہے کہ استاد لیکچر ہمیشہ رُک رُک کر سمجھاتے ہوئے واضح الفاظ میں دے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے باب قائم کیا ہے: ''**من أعاد الحدیث ثلاثًا لِیُفْهَمَ عنه**''۔ (۳۹) اس باب میں انہوں نے استدلال کے لیے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے: ''**إنه إذا تکلم بکلمة تکلم ثلاثًا لیفهم عنه**''۔ (۴۰)

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرماتے تو تین مرتبہ دہراتے تھے، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر جگہ تکرار کی عادت نہیں تھی، بلکہ یہ تکرار وہاں ہوتی جہاں افہام کی ضرورت پیش آتی، مثلاً: یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ سن کر بات ذہن نشین نہیں ہوئی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر تکرار فرماتے جہاں ابلاغ و تعلیم مقصود ہو یا کہیں مجمع زیادہ ہوتا اور آواز نہیں پہنچ پاتی یا زجر مقصود ہوتا تو تکرار فرماتے۔ (۴۱)

نتائج

۱:......تعلیم دینے کے لیے استاد کی تربیت کا اہتمام ضروری ہے، جو استاد تربیت یافتہ نہ ہو، وہ طلبہ کو اچھے انداز میں تعلیم نہیں دے سکتا۔

۲:......محدثین، مفسرین اور علمائے دین نے تعلیم و تربیت کے لیے ایسے اصول و قواعد وضع فرمائے ہیں جن کی افادیت آج کے جدید دور میں بھی مسلم ہے۔

۳:......امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے احادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں معلمین کی تربیت کے لیے قابل تقلید ایک مکمل خاکہ پیش کیا ہے۔

حواشی

۱:......صحیح بخاری، باب فضل العلم، ج:۱، ص:۱۴۔

۲:......ایضاً، باب من سُئل علماً وھو مشتغل فی حدیثہ، ج:۱، ص:۱۴۔

۳:......کشف الباری، ج:۳،ص:۵۲،طبع: مکتبہ فاروقیہ کراچی ۲۰۰۶ء۔

۴:......صحیح بخاری، ج:۱،ص:۱۴،طبع: اصح المطابع دہلی، ۱۹۳۸ء۔

۵:......ایضاً، ج:۱،ص:۱۴۔

۶:......الادب المفرد۔ دارالبشائرالاسلامیہ بیروت ۱۴۰۱ھ

۷:......صحیح بخاری، باب من رفع صوتہ بالعلم، ج:۱،ص:۱۴۔

۸:......تقریر بخاری، مولانا محمد زکریا، ج:۱،ص:۱۶۶۔

۹:......تقریر بخاری، مولانا محمد زکریا، ج:۱،ص:۱۶۸۔

۱۰:......صحیح بخاری، باب طرح الامام المسئلة علی اصحابہ الخ، ج:۱۳،ص:۱۳۴۔

۱۱:......ایضاً۔

۱۲:......کشف الباری۔

۱۳:......صحیح بخاری، باب القراءة والعرض علی المحدث، ج:۱،ص:۱۴۔

۱۴:......ایضاً، باب من قعد حیث ینتھی بہ المجلس، ج:۱،ص:۱۵۔

۱۵:......تقریر بخاری، مولانا محمد زکریا، ج:۱،ص:۱۷۲۔

۱۶:......صحیح بخاری، باب قول النبیؐ رب مبلغ اوعی من سامعٍ، ج:۱،ص:۱۶۔

۱۷:......تقریر بخاری، مولانا محمد زکریا، ج:۱،ص:۱۷۴۔

۱۸:......صحیح بخاری، باب رب مبلغ اوعیٰ من سامعٍ، ج:۱،ص:۱۶۔

۱۹:......تقریر بخاری، مولانا محمد زکریا، ج:۱،ص:۱۷۵۔

۲۰:......شرح عقود رسم المفتی، علامہ شامی، سہیل اکیڈمی لاہور، ص:۱۵-۱۶۔

۲۱:......صحیح بخاری، باب رب مبلغ اوعی من سامع، ج:۱،ص:۱۶۔

۲۲:......الرسول والعلم، القرضاوی، اسلامک بک ڈپو لاہور ۱۹۹۸، ص:۱۵۲

۲۳:......صحیح بخاری، ج:۱،ص:۱۶۔

۲۴:......ایضاً

۲۵:......ایضاً

۲۶:......الرسول والعلم، القرضاوی، اسلامک بک ڈپو لاہور ۱۹۹۸، ص:۱۶۰۔

۲۷:......صحیح بخاری، باب الفہم فی العلم، ج:۱،ص:۱۶۔

۲۸:......ایضاً، باب تفقھوا قبل ان تسودوا، ج:۱،ص:۱۶۔

۲۹:......ایضاً

۳۰:......ایضاً، باب الخروج فی طلب العلم، ج:۱،ص:۱۷

۳۱:......ایضاً، باب من علم وعلم، ج:۱،ص:۱۷۔

۳۲:......ایضاً

۳۳:......تفہیم البخاری، اسلامی کتب خانہ لاہور، ج:۱،ص:۸۵۔

۳۴:......الابواب والتراجم لصحیح البخاری، ایچ ایم سعید کمپنی، ص:۵۱۔

۳۵:......صحیح بخاری، باب الغضب والموعظة فی التعلیم، ج:۱،ص:۱۸

۳۶:......الابواب والتراجم لصحیح البخاری، ایچ ایم سعید کمپنی۔ص۵۲۔

۳۷:......صحیح بخاری، باب الغضب والموعظة فی التعلیم، ج:۱،ص:۱۸۔

۳۸:......ایضاً

۳۹:......ایضاً

۴۰:......ایضاً

۴۱:......کشف الباری، ج:۳،ص:۵۸۶۔

www.banuri.edu.pk

گناہ اور معصیت!

مصائب وآفات اور پریشانیوں کا سبب

محمد شفیق الرحمٰن علوی

مختلف انسان مختلف قسم کی پریشانیوں میں گرفتار ومبتلا رہتے ہیں: کسی کو جانی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو کسی کو مالی، کسی کو منصب کی پریشانی ہوتی ہے تو کسی کو عزت وآبرو کی، امیر اپنی کوٹھی میں پریشان تو غریب جھونپڑی میں، کوئی روزگار اور حالات سے نالاں تو کوئی عزیز واقارب اور دوست واحباب سے شاکی۔ تقریباً ہر آدمی کسی نہ کسی فکر، بے سکونی اور پریشانی میں مبتلا ہے۔

دلی سکون، قرار اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے ہر ایک اپنے ذہن اور اپنی سوچ کے مطابق اپنی پریشانیوں کی از خود تشخیص کر کے ان کے علاج میں لگتا ہے۔ کوئی اقتدار، منصب یا عہدہ میں سکون تلاش کرتا ہے، مگر جب اُسے مطلوبہ منصب مل جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں تو سکون نام کی کوئی چیز ہی نہیں، بلکہ منصب کی ذمہ داریوں اور منصب کے زوال کے اندیشوں کی صورت میں اور زیادہ تفکرات ہیں۔

کسی نے سمجھا کہ سکون صرف مال ودولت کی کثرت وفراوانی میں ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو یہ مال ودولت حاصل ہوا، اُن میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ کاروباری تفکرات، ترقی کا شوق، دن بدن بڑھتی ہوئی حرص اور تجارت میں نقصان کے اندیشوں سے اُن کی راتوں کی نیند حرام ہے، الا ماشاء اللہ۔ کسی نے رقص وسرود اور شراب وکباب کو باعثِ سکون جانا، مگر وقتی اور عارضی لذت کے بعد پھر بھی بے چینی اور اضطراب برقرار۔ کسی نے منشیات کا سہارا لیا، مگر اس میں بھی صرف عارضی دل بہلاوا، عارضی فائدہ اور دائمی نقصان۔ کسی نے نت نئے فیشن کر کے دل بہلانے کی کوشش کی، مگر سکون وقرار نہ ملا۔

جبکہ ایک طبقہ (دینی ذہن رکھنے والوں) کا یہ خیال ہے کہ مختلف پریشانیوں اور مصیبتوں سے بچاؤ کا اصل طریقہ اور اُن کا حقیقی علاج صرف ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو گناہگار، خطاکار، نافرمان اور قصوروار سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اور گناہوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کو راضی کرلیا جائے، کیونکہ سکون وراحت کے سب خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، وہی ان کا مالک ہے، جب

مالک راضی ہوگا تو خوش ہوکر اپنی مملوکہ چیز (سکون وراحت) اپنے فرمانبردار بندوں کو عطا کرے گا اور وہ مالک راضی ہوتا ہے نافرمانی اور گناہوں کو چھوڑنے اور فرمانبرداری اختیار کرنے سے۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ ہر اچھے یا بُرے عمل کا ردعمل ضرور ہوتا ہے، دنیا میں پیش آنے والے حالات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی چیز انسان کے اچھے یا بُرے اعمال ہیں جن کا براہِ راست تعلق اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ناراضی سے ہے۔ کسی واقعہ اور حادثہ کے طبعی اسباب جنہیں ہم دیکھتے، سُنتے اور محسوس کرتے ہیں، وہ کسی اچھے یا برے واقعہ کے لیے محض ظاہری سبب کے درجہ میں ہیں۔ سادہ لوح لوگ حوادث وآفات کو صرف طبعی اور ظاہری اسباب سے جوڑتے اور پھر اِسی اعتبار سے اُن حوادث سے بچاؤ کی تدابیر کرتے ہیں۔ شرعی تعلیمات کی روشنی میں بحیثیت مسلمان ہمیں یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور امر سے ہوتا ہے، جس کا عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ ادراک کرنے سے ہم قاصر ہیں، وحی الٰہی اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جزاء وسزا کا جو نظام سمجھایا ہے، وہ ہمیں اس غیبی نظام کے بارے میں آگاہ کرتا ہے، وہ یہ کہ کسی بھی واقعہ اور حادثہ کا اصل اور حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حالات کو (خواہ اچھے ہوں یا بُرے) انسانی اعمال سے جوڑا اور وابستہ فرمایا ہے، چنانچہ انسان کے نیک وبداعمال کی نوعیت کے اعتبار سے احوال مرتب ہوتے ہیں: صحت ومرض، نفع ونقصان، کامیابی وناکامی، خوشی وغمی، بارش وخشک سالی، مہنگائی وارزانی، بدامنی ودہشت گردی، وبائی امراض، زلزلہ، طوفان، سیلاب وغیرہ، وغیرہ، یہ سب ہمارے نیک وبداعمال کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر: ان سب احوال کے ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں، مگر حقیقی اسباب ہمارے نیک وبداعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح کے خوفناک اور عبرت انگیز واقعات (خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی) دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''الارم'' اور ''تنبیہ'' ہوتے ہیں، تاکہ انسان اپنے اعمال کا محاسبہ کرے اور کوئی تنبیہ اس کے غفلت شعار دل کو جُنبش دینے میں کامیاب ہوجائے:

جب بھی میں کہتا ہوں: اے اللہ! میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

دُنیا میں پیش آمدہ اچھے یا بُرے واقعات سے حاصل ہونے والا انسانی تجربہ بھی اسی پر شاہد ہے کہ بہت سارے لوگوں اور قوموں پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے دُنیا میں ہی مختلف قسم کے عذاب آئے ہیں، مثلاً: کوئی مسخ کیا گیا، کوئی زمین میں دھنسایا گیا، کوئی دریا میں غرق کیا گیا، کوئی طوفان کی نذر ہوا۔ ان تباہ شدہ اقوام کی بستیوں کے کھنڈرات آج بھی اس حقیقت پر دال ہیں کہ نافرمانی سببِ عذاب وپریشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیثِ مبارکہ میں اعمال کی حسبِ نوعیت تاثیرات کو (جیسی کرنی ویسی بھرنی کے بمصداق) مختلف پہلوؤں اور طریقوں سے بیان فرمایا ہے، امت

کو بدعملیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ فرما کر اعمال کی اصلاح کا حکم دیا ہے، چنانچہ یہ مضمون قرآن کریم کی دسیوں آیات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سینکڑوں احادیث سے صراحۃً ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱:...... ''مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً''۔ (النحل:۹۷)

ترجمہ:...... ''جو کوئی نیک کام کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو، تو ہم اُسے پاکیزہ (یعنی عمدہ) زندگی دیں گے''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ نیکی پُرسکون زندگی کا سبب ہے، چنانچہ دو چیزوں (ایمان اور اعمال صالحہ) کے موجود ہونے پر اللہ تعالیٰ نے ''حیٰوۃ طیبة'' یعنی با لطف، عمدہ اور پُرسکون زندگی عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔ عام آدمی بھی یہ آیت پڑھ کر یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ نہ ہوں یا کوئی ایک نہ ہو تو ''حیٰوۃ طیّبة'' یعنی ''پُرسکون زندگی'' نصیب نہ ہوگی، بلکہ ''پریشان زندگی'' ہوگی۔

۲:...... ''وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكاً وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمىٰ'' (طٰہٰ:۱۲۴)

ترجمہ:...... ''اور جو شخص میرے ذکر (نصیحت) سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے (دنیا اور آخرت میں) تنگی کا جینا ہوگا''۔

مطلب یہ ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل نہ کی، بلکہ نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا کی زندگی تنگ کردیں گے، ظاہری طور پر مال و دولت، منصب وعزت مل بھی جائے تو قلب میں سکون نہیں آنے دیں گے، اس طور پر کہ ہروقت دنیا کی حرص، ترقی کی فکر اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہے گا۔ اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوا کہ ''نافرمانی سببِ پریشانی اور فرمانبرداری سببِ سکون ہے''۔

۳:...... ''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ''۔ (الروم:۴۱)

ترجمہ:...... ''خشکی اور تری میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی (اعمال) کے سبب خرابی پھیل رہی ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کے بعض اعمال کا مزہ انہیں چکھادے، تاکہ وہ باز آجائیں''۔

۴:...... ''وَمَآ أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ''۔ (الشوریٰ:۳۰)

ترجمہ:...... ''اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سارے (گناہوں) سے تو وہ (اللہ تعالیٰ) درگزر کردیتا ہے''۔

ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ مصیبت اور فساد کا سبب خود انسان کے اپنے کیے ہوئے بُرے اعمال ہیں، اور یہ بھی بآسانی سمجھ میں آرہا ہے کہ: اگر بُرے اعمال نہ ہوں تو یہ مصائب، آفات اور فسادات وغیرہ بھی نہ ہوں گے۔ نتیجہ یہی نکلا کہ ''نافرمانی سببِ پریشانی اور فرمانبرداری سببِ سکون ہے''۔

۵:...... ''وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرىٰ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَأَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ''۔ (الاعراف:۹۶)

ترجمہ:......''اور اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے، لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا''۔

یعنی ایمان اور تقویٰ (اعمالِ صالحہ) برکت وخوشحالی کا ذریعہ اور بُرے اعمال عذاب و پکڑ اور پریشانی کا سبب ہیں۔

۶:......''وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّیَزِدْکُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِکُمْ وَلَاتَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ''۔ (ہود:۵۲)

ترجمہ:......''اور اے میری قوم! تم اپنے گناہ اپنے رب سے معاف کراؤ اور اس کے سامنے توبہ کرو، وہ تم پر خوب بارش برسائے گا اور تم کو قوّت دے کر تمہاری قوّت میں زیادتی کرے گا اور مجرم رہ کر اعراض مت کرو''۔

۷:......''فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّهٗ کَانَ غَفَّارًا، یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا، وَیُمْدِدْکُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّ یَجْعَلْ لَّکُمْ أَنْهٰرًا۔'' (نوح:۱۲)

ترجمہ:......''تو میں نے کہا کہ: گناہ بخشواؤ اپنے رب سے، بے شک وہ بخشنے والا ہے، تم پر آسمان کی دھاریں (تیز بارشیں) برسائے گا اور بڑھادے گا تم کو مال اور بیٹوں سے اور بنادے گا تمہارے واسطے باغ اور بنادے گا تمہارے لیے نہریں''۔

ان دونوں آیات میں نعمتوں اور برکات کے حصول کا طریقہ گناہوں سے توبہ، استغفار اور تقویٰ کو بیان فرمایا ہے، جب معلوم ہوا کہ گناہوں کا چھوڑنا اور توبہ کرنا مال واولاد کی کثرت اور خوشحالی کا سبب ہے تو اس سے لازمی طور صاحبِ عقل وشعور یہی نتیجہ نکالے گا کہ ''گناہ اور نافرمانی' نعمتوں میں کمی اور بدحالی کا سبب ہے''۔

۸:......''وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا، وَیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَایَحْتَسِبُ''۔ (الطلاق:۲،۳)

ترجمہ:......''اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے، جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا''۔

اس آیت میں تقویٰ کو نجات اور وسعتِ رزق کا سبب بتایا ہے اور اس کا عکس یہی ہے کہ نافرمانی اور گناہ' پریشانیوں میں گرفتار ہونے اور قلتِ رزق اور نعمت میں کمی کا سبب ہے۔

۹:......''وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً کَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً یَّأْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ''۔(النحل:۱۱۲)

ترجمہ:......''اور بتائی اللہ نے ایک بستی کی مثال جو چین وامن سے تھے، چلی آتی تھی اس کی روزی فراغت سے ہر جگہ سے، پھر ناشکری کی اللہ کی نعمتوں کی، پھر مزہ چکھایا اس کو اللہ نے بھوک اور خوف کے لباس کا''۔

اگر غور کیا جائے تو یہ آیت درحقیقت ایک آئینہ ہے، جس میں ہر بستی اور ہر ملک والے اپنی حالت دیکھ اور جانچ سکتے ہیں۔ جس کی حالت اس بستی کی طرح ہے، وہ سمجھ لے کہ اُس سے غلطی بھی اُنہیں کی طرح ہوئی ہے۔ اپنے ملک کے موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے آیت کے ترجمہ کو دوبارہ پڑھیں اور غور کریں تو صاف پتہ چلے گا کہ ہم میں اور ان بستی والوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے اسلامی ملک پاکستان کے ساتھ مسلمانانِ پاکستان نے جو غیر اسلامی سلوک روا رکھا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری ہے، جس کے نتیجہ میں ہم پر آج برے حالات مسلط ہیں۔ ہمارے وطنِ عزیز ملک پاکستان کے منجملہ بڑے مسائل میں سے دو مسئلے بہت خطرناک اور انتہائی پریشان کن ہیں۔ ا:...... مہنگائی۔ ۲:...... بدامنی اور دہشت گردی۔ اس آیت میں بھی ناشکری کی دو سزائیں مذکور ہیں، ہم نے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری اور اُس کی نافرمانی کی ہے، اس لیے ہم ان حالات کا شکار ہیں۔ بہرحال قرآن مجید کی یہ آیت ٹھیک ٹھیک ہمارے حالات پر چسپاں ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔

بہت سی احادیث بھی صراحۃً اسی مضمون ''نافرمانی سببِ پریشانی اور فرمانبرداری سببِ سکون'' پر دلالت کرتی ہیں۔ ''مشتے نمونہ از خروارے'' یہاں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس وقت کیا ہوگا؟ جب پانچ چیزیں تم میں پیدا ہوجائیں گی اور میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تم میں پیدا ہوں یا تم ان (پانچ چیزوں) کو پاؤ، (وہ یہ ہیں): ا...... بے حیائی: جسے کسی قوم میں علانیہ (ظاہراً) کیا جاتا ہو تو اس میں طاعون اور وہ بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جو ان سے پہلوؤں میں نہیں تھیں۔ ۲...... اور جو قوم زکوٰۃ سے رک جاتی ہے تو وہ (درحقیقت) آسمان سے ہونے والی بارش کو روکتی ہے اور اگر جانور نہ ہوتے تو ان پر بارش برستی ہی نہیں۔ ۳...... اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو وہ قحط سالی، رزق کی تنگی اور بادشاہوں کے ظلم میں گرفتار ہوجاتی ہے۔ ۴...... اور امراء جب اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے بغیر فیصلے کرتے ہیں تو ان پر دشمن مسلط ہوجاتا ہے جو ان سے ان کی بعض چیزوں کو چھین لیتا ہے۔ ۵...... اور جب اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں جھگڑے پیدا کردیتا ہے''۔ (الترغیب، ج:۳، ص:۱۶۹)

مذکورہ حدیث میں مختلف گناہوں کو مختلف آفات و پریشانیوں کا سبب بتایا گیا ہے، اس قدر صراحت کے بعد بھی کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ: ''نافرمانی سببِ پریشانی و عذاب ہے''؟۔

ایک اور روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''عبادَ اللّٰه! لَتُسَوُّنَّ صفوفَكم أو ليخالفَنَّ اللّٰهُ بين وجوهكم۔'' (مشکوٰۃ، ص:۹۷)

www.banuri.edu.pk

ترجمہ: ......’’اے اللہ کے بندو! تم اپنی صفوں کو درست کرلو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں (یعنی دلوں) میں اختلاف پیدا کردے گا‘‘۔

مذکورہ حدیث میں صفوں کو سیدھا نہ کرنے کے فعل بد پر (جو ہے بھی بظاہر چھوٹا گناہ) آپس میں اختلافات پیدا ہونے کی وعید ہے، اس سے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ بُرے اعمال سبب پریشانی ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ایک حدیث میں ہے کہ:

’’أعمالکم عمالکم و کما تکونوا یولی علیکم‘‘۔ (کشف الخفاء ج:۱،ص:۱۴۷،بحوالہ طبرانی)

ترجمہ: ......’’تمہارے اعمال ہی (درحقیقت) تمہارے حاکم ہیں اور جیسے تم ہوگے ایسے ہی حاکم تم پر مسلّط ہوں گے‘‘۔

یہ حدیث بھی اعمالِ بد کے برے نتائج برآمد ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ برے اور ظالم حکمران بھی اعمالِ بد کی وجہ سے مسلط ہوتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہاں ذکر کردیا جائے، جو مذکورہ مسئلہ پر دلالت کرتا ہے: ’’حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک دفعہ مدینہ اور حجاز کے علاقہ میں زبردست قحط پڑا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصر وشام کے علاقہ سے کثیر مقدار میں غذائی اشیا منگوائیں، مگر قحط کسی طور پر کم نہ ہوا، ایک صحابی بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ کو خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو سمجھتا تھا کہ عمرؓ سمجھدار آدمی ہے! اس صحابیؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواب سنایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت پریشان ہوئے اور نمازِ فجر کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ کیا تم لوگوں نے میرے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی تبدیلی محسوس کی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: نہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کچھ تعریف کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھنے والے صحابیؓ کو فرمایا کہ اپنا خواب بیان کریں۔ خواب سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: امیر المؤمنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جانب متوجہ فرمارہے ہیں کہ قحط کے حالات سے نمٹنے کے لیے آپ دنیا کے ظاہری اسباب تو اختیار فرمارہے ہیں، لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ سے رجوع نہیں کیا، یعنی نمازِ استسقاء نہیں پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ حق قبول کرنے کا مزاج رکھتے تھے تو آپؓ نے نمازِ استسقاء ادا فرمائی اور ایسی بارش ہوئی کہ مدینہ کا طویل قحط دور ہوا۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۷،ص:۲۰۳،۲۰۴)

اس واقعہ پر غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ اچھے اعمال کا اثر بھی اچھا اور بُرے اعمال کا اثر بھی بُرا ہوتا ہے، جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں نمازِ استسقاء (جو نیک عمل ہے) کا اثر اچھا ہوا۔ اور اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسائل صرف ظاہری اسباب سے حل نہیں ہوتے، بلکہ ان کے لیے باطنی اسباب بھی ضروری ہوتے ہیں۔

ممکن ہے کسی کو یہ تردّد اور اشکال ہو کہ عجیب بات ہے، پریشانی دنیوی ہے اور مشورہ دنیوی اسباب کے بجائے گناہوں اور نافرمانیوں کے چھوڑنے کا دیا جارہا ہے، یعنی بظاہر ان دونوں باتوں کا آپس میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔

اس اعتراض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہوں کو پریشانی اور نیکی کو راحت واطمینان کا سبب قرار دے دیا تو ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ عقل میں آئے یا نہ آئے، بلاتردُّد ''أٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا'' کہے اور بزبانِ حال یوں گویا ہو کہ:

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

کیونکہ جس ذات پر ایمان لائے ہیں، اس کا یہی فرمان ہے، اس لیے ماننے کے سوا چارۂ کار نہیں۔

دوسرا جواب عقلی لحاظ سے یہ ہے کہ مال ودولت، عزت ومنصب، صحت وتندرستی، راحت وسکون وغیرہ، یعنی دنیا کی ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے خزانہ اور ملکیت میں ہے، جب ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے خزانہ اور ملکیت میں ہے تو پھر سوچیے کہ کیا مالک (اللہ تعالیٰ) جس کے دربار میں نہ ہی چوری ممکن ہے اور نہ زبردستی سفارش، اس کو راضی کیے بغیر کچھ لیا جاسکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرکے ہی پریشانیوں سے چھٹکارا اور راحت وسکون مل سکتا ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں: بعض اوقات نیک وصالح، دین دار، حتیٰ کہ بزرگ حضرات بھی مصیبت وپریشانی میں مبتلا ہوجاتے ہیں، حالانکہ وہ گناہوں سے بھی بچ رہے ہوتے ہیں، فرمانبرداری بھی کررہے ہوتے ہیں، ایسا کیوں ہے؟۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ قاعدہ اکثریہ ہے یعنی اکثر پریشانیاں گناہوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے آتی ہیں، مگر بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو بطورِ آزمائش ہوتی ہیں اور نتیجۃً نعمت کے حصول کا سبب بنتی ہیں، وہ اس طرح کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے کو کسی خاص اخروی درجہ اور مرتبہ پر فائز کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ اپنی بشری کمزوری کی وجہ سے نیکیوں کی بنیاد پر اُس کا مستحق نہیں بن سکتا تو اللہ تعالیٰ اُس کے مرتبہ کو مزید بڑھانے اور اونچا کرنے کے لیے دنیا کے اندر آزمائش (بیماری، پریشانی وغیرہ) میں مبتلا کردیتے ہیں تو یہ مصیبت درحقیقت مصیبت نہیں ہوتی، بلکہ ایک طرح کی نعمت ہوتی ہے جو نتیجۃً رفعِ درجات کا سبب بنتی ہے، انبیاء علیہم السلام کی تکالیف اور آزمائشیں اسی قبیل سے ہیں، ان کی مثال اُس محنت کی طرح ہے جو کسی نعمت کے حصول میں کرنی پڑتی ہے، جیسے شہد کے حصول میں بعض اوقات شہد کی مکھی کے ڈنک سہنے پڑتے ہیں، تو اس طرح کی پریشانیاں دراصل شہد کی مکھی کے اُن ڈنکوں کی طرح ہیں جو بالآخر شہد جیسی نعمت کے حصول پر منتج ہوتے ہیں۔

اس شبہ کا دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس نیک بندے سے بشری کمزوری کی بنا پر کبھی کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جو بڑے رحیم وکریم ہیں، اپنے خاص بندے

www.banuri.edu.pk

کے اس گناہ کو دنیا ہی میں دھونے کے لیے اُسے مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں، تاکہ وہ آخرت کی بڑی رُسوائی اور بڑے عذاب سے بچ جائے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک صورت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ انسان نہیں کرسکتا۔

ان دو جوابات کا حاصل یہ ہے کہ انسان پر آنے والی پریشانی دو قسم کی ہوتی ہے: ایک پریشانی وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوتا ہے، جو اخروی عذاب کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ اصل دارالجزاء تو آخرت ہے، دنیا دارالعمل ہے، مگر کبھی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اخروی عذاب کا ایک ادنیٰ سا نمونہ دنیا میں بھی دکھا دیتا ہے، تاکہ انسان نافرمانی سے باز آجائے، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔'' (السجدۃ:۲۱)

''اور ہم ضرور ان کو قریب کا چھوٹا عذاب چکھائیں گے بڑے عذاب سے پہلے، تاکہ وہ لوٹ آئیں۔''

اور پریشانی کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں ہوتی، بلکہ اس کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے جو رفع درجات یا گناہوں کے مٹنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور یہ پریشانی اور تکلیف درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہوتی ہے کہ اس چھوٹی سے تکلیف کے سبب اللہ تعالیٰ اپنے کمزور بندے کو آخرت کے بڑے عذاب سے بچا لیتے ہیں یا رفع درجات کی صورت میں آخرت کی بڑی نعمت عطا فرما دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک حدیث میں ہے کہ:

''أشد الناس بلاء الأنبياء ثم الأمثل فالأمثل۔''

''سب سے زیادہ آزمائش انبیاء علیہم السلام پر آتی ہے، پھر جو اُن کے جس قدر زیادہ مشابہ ہو۔''

یعنی انبیاء علیہم السلام پر زیادہ آزمائشیں آئیں اور پھر جس کا جس قدر اُن سے زیادہ تعلق ہوگا، زیادہ قرب ہوگا، زیادہ اتباع ہوگی، اس پر بھی آزمائشیں زیادہ آئیں گی، مگر خدانخواستہ انبیاء علیہم السلام پر آنے والی یہ تکالیف اور آزمائشیں کوئی سزا نہیں تھیں، بلکہ ان کے درجات کو مزید بلند کرنا مقصد تھا۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ نافرمان لوگ جو مال دار ہیں، بظاہر خوش نظر آتے ہیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے کہ مالداری ایک نعمت ہے اور خوشی اور آرام کا ظاہری سبب ہے، مگر ضروری نہیں کہ جو مال دار ہو، وہ خوشحال اور پرسکون بھی ہو، کیونکہ بعض لوگوں کے پاس بظاہر مال و دولت اور سامانِ عیش و عشرت تو ہوتا ہے، مگر ان کا دل قناعت و توکل سے خالی ہونے کی بنا پر ہر وقت دنیا کی مزید حرص، ترقی کی فکر، اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہتا ہے، ذرا اُن سے پوچھ کر تو دیکھئے کہ وہ راحت و آرام کے سارے اسباب اپنے پاس رکھنے کے باوجود سکونِ دل کی دولت سے کتنے محروم ہیں؟ ہاں! اگر کوئی ایک آدھ فرد ایسا مل جائے جو نافرمان ہونے کے باوجود بھی خوش ہو تو وہ شاذ و نادر مثال ہوگی اور شاذ و نادر کا اعتبار نہیں ہوتا، حکم اکثریت پر لگتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ

نافرمانوں کی اکثریت پریشان ہی رہتی ہے۔ دراصل قلبی سکون اور حقیقی اطمینان مال سے حاصل ہونے والی چیز ہی نہیں ہے، اس کا تعلّق اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کے ذکر سے ہے، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: ''أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ'' یعنی ''خبردار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ہوتا ہے''۔ مگر ہم میں سے اکثر لوگ چونکہ ذکر اللہ کی لذت سے بالکل کورے ہیں، اس لیے ہمیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا، دراصل ہم نے اس وادی میں قدم ہی نہیں رکھا، بقولِ شاعر:

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

مذکورہ اعتراض کا یہ جواب بھی ہے کہ جو نافرمان بظاہر خوشحال ہیں، انہیں دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے، جو چندروزہ ہے، یہ چندروزہ خوشحالی لمبی پریشانی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جس خوشحالی کا انجام چندروز کے بعد دائمی تباہی ہو، اسے خوشحالی کہنا کہاں زیبا ہے؟ جیسے چوہا زہر ملی ہوئی چیز کھا کر خوش ہوتا ہے، مگر اس میں اس کی تباہی پوشیدہ ہوتی ہے۔

اصل نکتہ کی بات یہ ہے کہ سکون وراحت کا تعلّق صرف جسم سے نہیں ہے، بلکہ جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی ان کا تقاضہ کرتی ہے، مادی وسائل اور راحت وسکون کے ظاہری اسباب جسم کو تو آرام دے سکتے ہیں، مگر روح کو قرار اور دل کو سکون بخشنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ روح کی تسکین اور اس کی غذا عبادت اور ذکر اللہ ہیں، کیونکہ انسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ کسی لافانی ذات کی بندگی کرے، اس فطری خواہش کی تسکین مادہ پرست زندگی کے اسباب ووسائل سے پوری نہیں ہوسکتی، روح کی تسکین کے لیے روحانی اسباب (اعمالِ صالحہ جیسے ذکر اللہ اور عبادت وغیرہ) کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

ایک بزرگ نے یہی بات کیا ہی خوب صورت انداز میں بیان فرمائی ہے کہ:

''یہ خدا ناآشنا زندگی کا لازمی خاصّہ ہے کہ اس کے شیدائی ایک انجانی سی بے قراری کا شکار رہتے ہیں، اس بے قراری کا ایک کرب انگیز پہلو یہ ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بے قرار کیوں ہیں؟ وہ ہمہ وقت اپنے دل میں ایک نامعلوم اضطرار اور پراسرار کسک محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ اضطراب کیوں ہے؟ کس لیے ہے؟ وہ نہیں جانتے''۔

خلاصہ یہ کہ ہم پر جو پریشانیاں اور مصیبتیں آتی ہیں، وہ ہمارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہیں، لہٰذا پُرسکون اور پُراطمینان زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی گزشتہ کوتاہیوں پر نادم ہوکر اللہ تعالیٰ سے ان پر معافی مانگیں، فی الفور نافرمانی چھوڑ کر آئندہ اپنے اعمال کی اصلاح کریں۔

واللّٰہ الموفّق والمعین وبہ نستعین وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

فرض نمازوں کے بعد دعا کی اہمیت

(دوسری قسط)

ترجمہ: مولانا عمران ولی

نماز کے بعد دعا ترک کرنے پر حدیث میں مذمت

۱۵:......امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مطلب بن ابی وداعۃ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تہجد (کی نماز) دو دو رکعتیں ہیں، ہر دو رکعت پر قعدہ ہے، اور نماز خشوع وخضوع اور تمسکن ہے، اور آپ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے پروردگار کی طرف اٹھائیں، اور یوں کہیں (دعا مانگیں) اے اللہ! میری مغفرت فرما۔ پس جس نے ایسا نہیں کیا (یعنی دل نہ لگایا، نہ عاجزی اور مسکنت وبے چارگی ظاہر کی، اس میں دعا نہ کرنا بھی شامل ہے) تو (ایسی) نماز ناقص ہے''۔ (۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: ''وتشهد فی کل رکعتین'' یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ''مثنیٰ'' کی تفسیر ہے، جس طرح کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث ''صلاة اللیل مثنیٰ مثنیٰ'' (کے الفاظ) ''مثنی مثنی'' کی تفسیر اس (تشهد فی کل رکعتین) سے فرمائی ہے، اور (حدیث میں مذکور) لفظ تشہد اور اس پر عطف (کردہ الفاظ) ''تباءس'' اور ''تمسکن'' افعال مضارع (کے صیغے) ہیں، ان (کے شروع میں) سے ایک تاء کو تخفیفاً حذف کیا گیا ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ''تباءس'' سے مراد دعا کے اندر خضوع یعنی عاجزی کرنے کو کہتے ہیں اور یہ (تباءس) ''بؤس'' سے ہے، عاجزی اور فقر وحاجت کے اظہار کو کہتے ہیں، اور (لفظِ) ''تمسکن'' یعنی اپنی دعا میں تضرع اور بے چارگی و بدحالی ظاہر کرنے کہتے ہیں۔

''تقنع یدک'' یہ اقناع سے ہے، اٹھانے کے معنی میں آتا ہے (یعنی دعا میں دونوں ہاتھوں کو اٹھانا مراد ہے) اسی طرح صاحب نہایہ نے فرمایا ہے اور لفظِ ''خداج'' کا معنی ہے: ناقص ہونا۔

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کا حکم اس بات پر دلیل ہے کہ اس دعا سے

مراد وہ دعا ہے جو دعا سلام کے بعد ہو، اس لیے کہ سلام سے پہلے دعا (کرنے) میں رفع الیدین (یعنی ہاتھ اٹھانا) نہیں ہے، اور نہ ہی کسی نے اس (سلام سے قبل دعا میں رفع الیدین کے) قول کو اختیار کیا ہے۔

۱۶: ......امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو رمثہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے: فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر کر بیٹھ گئے، وہ شخص جو تکبیر اولیٰ میں شریک تھا کھڑا ہو گیا اور دو رکعت نماز پڑھنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (یہ دیکھ کر) فوراً اُٹھے، اور اس شخص کے دونوں مونڈھے پکڑ کر ہلائے اور فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، کیوں کہ اہل کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) اسی لئے ہلاکت کی وادی میں جا گرے کہ وہ اپنی نمازوں کے درمیان (دعا کے ذریعہ) جدائی نہیں کرتے تھے۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر مبارک اوپر اٹھائی اور فرمایا کہ: اے خطاب کے بیٹے! اللہ نے تمہیں راہِ حق پر پہنچایا (یعنی تم نے سچ کہا)۔ (۲) صاحب مشکوٰۃ نے اس حدیث کو ''**باب الذکر بعد الصلاۃ**'' میں ذکر فرمایا ہے۔

۱۷: ......امام عبد بن حمید، امام ابن جریر، امام ابن المنذر، امام ابن حاتم اور امام ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہم نے مختلف سندوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ''**فإذا فرغت فانصب**'' کے بارے میں نقل کیا ہے کہ (انہوں نے اس کی تفسیر میں) فرمایا کہ: جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے رب کی طرف دعا میں اپنے آپ کو تھکا دو اور اس سے اپنی حاجت طلب کرو۔

۱۸: ......امام ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ''**فَإِذَا فَرَغْتَ (من الصلاة) فَانْصَبْ (إلى الدعاء) وَإِلٰى رَبِّکَ فَارْغَبْ (فی المسألة)**'' یعنی جب نماز سے فارغ ہو جائیں تو دعا میں توجہ و محنت کریں اور اپنے رب کی طرف دعا میں رغبت کریں۔

۱۹: ......امام فریابی، امام عبد بن حمید، امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ: انہوں نے ''**فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ**'' کی تفسیر میں فرمایا: ''جب تم بیٹھ جاؤ تو دعا اور سوال کرنے میں خوب محنت اور مشقت کرو''۔

۲۰: ......امام عبد الرزاق، امام عبد بن حمید، امام ابن جریر، امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ''**فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ**'' کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''یعنی جب تم اپنی نماز سے فارغ ہو جاؤ تو دعا میں خوب محنت کرو''۔

۲۱: ......حضرت عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن نصر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے ''**فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ**'' کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''جب تم اپنی فرض نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے رب کی طرف دعا اور مانگنے میں رغبت کرو''۔

۲۲: ......امام شمس الجزری رحمۃ اللہ علیہ نے ''**الحصن الحصین**'' میں یہ حدیث ذکر فرمائی ہے کہ:

''مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ، لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُولِ الْجَنَّةِ إِلَّا أَنْ يَمُوتَ''۔ (۳)

ترجمہ: ''جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے گا، اس کے لیے جنت میں داخلہ سے سوائے موت کے کوئی چیز مانع نہیں ہے''۔

اس حدیث مبارکہ کو امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں اور امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں (**بل أخرجه في كتاب الصلوة المفرد وصححه فيه**) اور امام ابن السنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''**عمل اليوم والليلة**'' میں نقل فرمایا ہے، جبکہ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''**الحصن الحصين**'' پر اپنی شرح میں یہ اضافہ فرمایا ہے کہ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ان سب نے اس کو حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔(۴) میں کہتا ہوں کہ اس باب میں جو احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام ہم نے ذکر کی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ فرض (نماز) کے بعد دعا (کرنا) سنت ہے۔

اعتراض:

اگر کہا جائے کہ شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ''**الصراط المستقيم**'' پر اپنی شرح میں فرماتے ہیں کہ: یہ جو آج کل عرب وعجم کے شہروں میں جو طریقہ متعارف ہوا ہے کہ مساجد کے ائمہ اور مقتدی حضرات سلام (پھیرنے) کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں (اس طور پر کہ) امام حضرات دعا کرتے ہیں اور مقتدی آمین کہتے ہیں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات وطریقہ (اور تعلیمات میں سے) نہیں ہے، اور اس بارے میں کوئی حدیث نہیں آئی ہے، (بلکہ) یہ ایک بدعت ہے جس کو پسند کرلیا گیا ہے، تو اس کا جواب کیا ہوگا؟

جواب:

میں کہتا ہوں کہ اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

۱:......ایک جواب یہ ہے کہ ''**مفتاح الصلاة**'' کے مصنف علامہ فتح محمد بن الشیخ عیسیٰ السطاوی اپنی ''**فتوح الصلاة**'' نامی کتاب میں فرماتے ہیں، جس کا خلاصہ وحاصل یہ ہے کہ بے شک شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بدعت (ہونے) کا حکم لگایا، اس لیے کہ شیخ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ صحاح ستہ وغیرہ میں مروی وہ احادیث جو نماز کے بعد دعاؤں کے بارے میں منقول ہیں، اس پر مطلع نہیں ہیں۔ (شیخ عیسیٰ کا کلام ختم ہوا)

۲:......دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر انہوں (شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ مراد لیا ہے کہ نفس دعا نماز کے بعد بدعت ہے، تو بلاشک ان کا قول صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ان کا یہ قول مردود ہے ان مذکورہ احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی بنا پر جو فرض نماز کے بعد دعا کی سنیت پر دلالت کرتی ہیں۔

۳:......تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی مراد یہ ہو کہ نماز کے بعد دعا اس مخصوص کیفیت کے ساتھ کہ ہاتھوں کو اٹھانا اور مقتدیوں کا آمین آمین کہنا بدعت ہے، تو یہ بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ ہاتھ اٹھانا (یعنی ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا) دعا کے سنن یعنی طریقوں میں سے ہے، اور دعا کے بعد ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا بھی سنن دعا میں سے ہے، اور سامعین کی طرف سے آمین آمین کہنا بھی سنن دعا میں سے ہے، اگر چہ یہ امورو (طریقے) سنن مستحبہ (سنن مؤکدہ) میں نہیں ہیں۔ اور سنن منقولہ سے مرکب کام کو بدعت قرار دینا صحیح نہیں ہے، اور رہی یہ بات کہ ہاتھ اٹھانا دعا کے طریقوں (آداب) میں سے ہے، سو یہ احادیث نبویہ سے ثابت ہے۔

دعا میں ہاتھ اُٹھانے کے بارے میں مروی احادیث

۲۳:......دعا میں ہاتھ اٹھانے کی بابت منقول روایات میں سے ایک روایت یہ ہے جس کو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بسند خلاد بن السائب عن ابیہ اور سائب بن یزید عن ابیہ یہ روایت نقل فرمایا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تو ہاتھ مبارک اٹھاتے اور (دعا سے فارغ ہوکر) ہاتھوں کو چہرۂ انور پر پھیرتے۔ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو اپنی معجم کبیر میں ''عن خلاد بن السائب عن ابیہ'' کی سند سے نقل کیا ہے۔

۲۴:......اسی طرح امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا میں ہاتھ مبارک اٹھاتے تو چہرۂ اقدس پر پھیرے بغیر نیچے نہیں فرماتے تھے۔

۲۵:......اور امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کی ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمائی ہے۔

اسی طرح (رفع الیدین فی الدعاء کی دلیل یہ بھی ہے کہ) امام ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ صاحب ''**الحصن الحصین**'' فرماتے ہیں کہ: بے شک (دعا میں) ہاتھوں کو اٹھانا دعا کے آداب میں سے ہے (اور) اس کو (محدثین کی) ایک جماعت یعنی اصحاب کتب ستہ نے روایت کیا ہے، اور یہ بات کہ ہاتھ کندھوں کے برابر تک اٹھے ہوئے ہوں، اس کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''مسند''، امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''سنن'' اور امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنف میں نقل کیا ہے۔ (۵)

۲۶:......ان روایات میں سے ایک روایت وہ بھی ہے جس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ سے مانگنا یہ ہے کہ دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اٹھائے یا اس کے برابر۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور الفاظ انہی کے ہیں، اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں اسے روایت کیا ہے۔

۲۷:......اسی طرح ایک روایت وہ بھی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ہاتھوں کا

اٹھانا استکانہ (عاجزی) ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''(ان کافروں نے) نہ عاجزی کی اور نہ اللہ کے سامنے گڑگڑائے۔'' دعا کے وقت ہاتھوں کے اٹھانے کے بارے میں احادیث بہت اور مشہور ہیں۔ اور رہی یہ بات کہ دعا سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا دعا کے آداب میں سے ہے تو یہ بھی احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، جن میں سے ابوداؤدؒ وطبرانیؒ کی دعا میں رفع الیدین کے بارے میں روایت ابھی آپ کے سامنے ہم نے پیش کیں۔ اور بعض وہ ہیں جو ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم رحمۃ اللہ علیہم کے حوالہ سے بعد میں آئیں گی۔

۲۸:......ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو جب تک چہرے پر پھیر نہ لیتے واپس نہ کرتے۔''

۲۹:......ان میں کی ایک حدیث ابن ماجہ کی ہے جو انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھوں کو چہرے پر پھیر دو۔''

جہاں تک متقدمین کے اس قول کا تعلق ہے کہ ''آمین آمین'' کہنا دعا کے آداب میں سے ہے تو یہ بھی احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ ایک حدیث تو امام جزری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حصن حصین میں ذکر کی ہے کہ دعا کے آداب میں سے ہے کہ سننے والا آمین کہے۔ یہ امام بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی رحمۃ اللہ علیہم کی روایت ہے۔ اور دعا کرنے والے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ دعا سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاتھوں کو چہرے پر پھیردے۔ اسے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان رحمۃ اللہ علیہم نے اپنی صحیح میں اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں نقل کیا ہے۔ اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مختلف دعائیں مانگیں اور ہارون علیہ السلام نے اس پر آمین کہا تو اللہ تعالیٰ نے دونوں کی دعائیں قبول کیں، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا'' (فرمایا: کہ تم دونوں کی دعائیں قبول کر لی گئی ہیں) جیسا کہ تفسیر کی کتابوں میں ہے۔

مصادر و مراجع

۱:......أبوداؤد، ۲/ ۴۰، کتاب الصلاۃ، باب فی صلاۃ النہار۔

۲:......أبوداؤد، ۱/ ۲۶۲-۲۶۳، کتاب الصلاۃ، باب فی الرجل یتطوع فی مکانہ الذی صلی فیہ المکتوبۃ۔

۳:......الحصن الحصین، ص: ۹۷، ط: لکھنؤ بالہند۔

۴:......النسائی فی عمل الیوم واللیلۃ، ص: ۱۸۲-۱۸۳، ثواب من قرأ آیۃ الکرسی دبر کل صلاۃ۔ ابن السنی فی عمل الیوم واللیلۃ، ص: ۱۱۰، رقم: ۱۲۴۔ المعجم الکبیر للطبرانی، ۸/ ۱۱۴۔

۵:......الحصن الحصین، ص: ۳۷۔

(جاری ہے)

الفاظِ طلاق سے متعلقہ اُصولوں کی تفہیم وتشریح

مفتی شعیب عالم

(دسویں قسط)

مباحث گزشتہ کا خلاصہ

گزشتہ سطور میں اکابر کی تحقیقات ہم ملاحظہ کرچکے، اگر ان تحریرات کے ساتھ دیگر اکابر اہل فتویٰ کے فتاویٰ جات بھی سامنے رکھے جائیں تو مجموعی حیثیت سے اضافت کے مسئلے کی چند صورتیں نکلتی ہیں، اضافت کے مسئلے کو صورتوں پر تقسیم کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ مسئلے کا فہم وضبط آسان ہوجاتا ہے اور ہر جزئیہ اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔

پہلی صورت:

اگر شوہر نے طلاق کی نسبت بیوی کی طرف نہ کی ہو، مگر وہ اپنی نیت بیوی کو طلاق دینے کی بیان کرتا ہے تو نیت کی وجہ سے اضافت موجود تسلیم کی جائے گی اور طلاق واقع ہوگی:

''...عدم وقوع آں وقت است کہ ارادۂ طلاق زن نہ باشد، نہ عرف جاری باشد۔''(۱)

''وقوع طلاق کی اضافت لفظی ضروری نہیں، بلکہ اضافت معنوی بھی کافی ہوجاتی ہے، اضافتِ معنویہ کے لیے نیت یا عرف دونوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔''(۲)

امداد الفتاویٰ کا جو مفصل اقتباس ماقبل میں گزرا، اس میں مذکور ہے کہ اضافت کا تحقق نیت سے بھی ہوتا ہے: ''دوم: نیت کمافی قولہ عینت امرأتی۔'' امداد الفتاویٰ میں ایک اور فتویٰ درج ہے، جس کا عنوان ہے: ''وقوع طلاق بلا تصریح اسم و بلا خطاب زوجہ'' اور جواب میں ذکر ہے کہ ''چونکہ دل میں اپنی ہی منکوحہ کو طلاق دینے کا قصد تھا، لہٰذا تینوں طلاقیں واقع ہوگئیں۔''(۳)

''...اس نے طلاق کی نسبت اور اضافت اپنی بیوی کی طرف نہیں کی اور نہ اس کا نام لیا، نہ اشارہ کیا اور اس کی غرض بھی اپنی زوجہ کو طلاق دینے کی نہ تھی، لہٰذا اس صورت میں اس کی زوجہ پر طلاق واقع نہیں ہوئی۔''(۴)

''....ہرگاہ زید نگفتہ است کہ ازیں لفظ طلاق طلاق، زوجہ ام مراد نیست، زوجہ اش مطلقہ

شود بدو طلاق، و ہرگاہ بعد ازاں دراں مجلس یا مجلس دیگر گفتہ کلمات .... ازیں لفظ یک طلاق بائنہ برزوجہ اش واقع شد...''(۵)

دوسری صورت:

تمام اردو اور عربی فتاویٰ اس پر متفق ہیں کہ اگر لفظوں میں اضافت ہو تو وقوعِ طلاق میں کوئی شک وشبہ نہیں، مثلاً: شوہر اپنی بیوی کا نام لے یا اس کا نسب یا کنیت یا لقب یا عرفیت ذکر کرے:

''...لو ذكر اسمها أو اسم أبيها أواسم أمها أو ولدها، فقال: عمرة طالق أوبنت فلان أو بنت فلانة أو أم فلان، فقد صرحو بأنها تطلق.''۔(۶)

تیسری صورت:

تیسری صورت یہ ہے کہ شوہر کے کلام میں تو بیوی کی طرف اضافت نہ ہو، مگر اس کا کلام کسی ایسی بات کے جواب میں ہو جس میں اضافت مذکور ہو تو اصول فقہ کے قاعدے اور زبان کے محاورے کے تحت اضافت موجود مانی جائے گی، کیوں کہ یہ اصولی قاعدہ ہے کہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے اور عرف عام میں ایک ''ہاں'' یا ''نا'' کو لمبی چوڑی تقریر کا جواب سمجھا جاتا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وفي الخانية: قالت له: طلقني ثلاثا فقال فعلت، أو قال طلقت وقعن....ان طلقني أمر بالتطليق، وقوله طلقت تطليق فصح جوابا، والجواب يتضمن إعادة مافي السؤال۔''(۷)

امداد الفتاویٰ کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ:

''سوم: اضافت در کلام سائل کما في قوله ''دادم'' في جواب قولها ''مرا طلاق دہ'' ولہٰذا ثلث واقع شود لتکرارها ثلاثا۔'' کفایت المفتی میں بھی اس مضمون کا فتویٰ مذکور ہے:

''سوال: زید نے اپنی منکوحہ کے بارے میں بحالت غصہ زبان سے تین طلاق کا لفظ نکالا، بلا اضافت کسی کے، زید نے جو تین طلاق کا لفظ زبان سے نکالا تو زید کے دل میں کچھ بھی نہیں تھا؟

جواب: اگر زید نے زبان سے صرف یہ لفظ نکالا تین طلاق، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تو ظاہر ہے کہ اس میں اضافت طلاق نہیں ہے، لیکن اگر یہ لفظ سوال کے جواب میں کہے ہوں، مثلاً: زوجہ یا اس کے کسی ولی یا رشتہ دار نے زید سے کہا کہ اپنی زوجہ کو طلاق دے دو اور زید نے کہا کہ تین طلاق تو اس صورت میں قرینہ حالیہ اضافت الی المنکوحہ کے ثبوت کے لیے کافی ہوگا اور قاضی طلاق کا حکم کرے گا ......اب چونکہ مجلس قضا کا وجود بھی نہیں ہے، اس لیے حکم دیانت یہ ہے کہ زید کو کہا جائے گا کہ اگر تو نے اپنی بیوی کو یہ لفظ کہا تھا تو طلاق مغلظہ ہوگئی اور اگر بیوی کو نہیں کہا تھا تو طلاق نہیں ہوئی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور لوگوں کے اطمینان کے لیے اس سے حلف لیا جائے گا، اگر وہ حلف سے کہہ دے کہ میں نے بیوی کو تین طلاق نہیں کہا تھا تو لوگوں کو بھی اس کے تعلق زن شوئی سے تعرض نہیں کرنا چاہیے.....۔''

درج ذیل جزئیات میں وقوعِ طلاق کی وجہ یہ ہے کہ سوال میں اضافت موجود ہے:

’’لو قال:طالق، فقيل له: من عنيت ؟ فقال: امرأتي، طلقت امرأته۔‘‘(۸)

’’اگرشوہر نے کہا کہ طلاق ہے،اور جب اس سے پوچھا گیا کہ کس کو؟ تواس نے کہا کہ میری بیوی کو،تواس کی بیوی کوطلاق ہوجائے گی۔‘‘

’’قالت : طلاق بدست تواست،مراطلاق کن‘فقال الزوج : ’’طلاق می کنم‘‘،وكرر ثلاثًا،طلقت ثلاثًا۔‘‘(۹)

’’بیوی نے کہا:’’طلاق تیرے اختیار میں ہے، مجھے طلاق دے۔‘‘تو جواب میں خاوند نے کہا:’’میں طلاق دیتاہوں‘‘اورتین مرتبہ یہ الفاظ دہرائےتو تین طلاقیں بیوی کو پڑ گئیں۔‘‘

ہندیہ میں بحوالہ ذخیرہ مذکور ہے:

’’سئل شمس الائمة الأوزجندی عن امرأة قالت لزوجها لو كان الطلاق بيدی لطلقت نفسی ألف تطليقة. فقال الزوج :’’من هزاردادم‘‘ولم يقل:’’دادم ترا‘‘ قال:يقع الطلاق۔‘‘(۱۰)

ترجمہ:...شمس الائمہ سے سوال ہوا کہ ایک عورت نے کہا کہ اگر طلاق میرے ہاتھ میں ہوتی تو میں اپنے آپ کو ہزار طلاقیں دے ڈالتی ،جس کے جواب میں شوہر نے کہا کہ میں نے ہزار دے دیں اور یہ نہ کہا کہ تجھے دیں تو امام شمس الائمہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ طلاق ہوگئی۔

بعض جزئیات میں شوہر کا کلام بیوی کے جواب میں ہے،مگراس کے باوجود طلاق واقع نہیں ہے،جس کی وجہ یہ ہے کہ شوہرصرف بیوی کے جواب پر اکتفانہیں کرتا، بلکہ کوئی زائد بات کہہ جاتا ہے جس سے اس کا کلام بیوی کا جواب نہیں رہتا، بلکہ ابتدائی کلام بن جاتا ہے اور اضافت کی شرط مفقود ہونے سے طلاق بھی واقع نہیں ہوتی:

’’سئل نجم الدين عمن قالت له امرأته مرابرگ باتوباشیدن نیست،مراطلاق ده، فقال الزوج : چوں تو روئے طلاق دادہ شد وقال لم أنو الطلاق هل يصدق ؟ قال: نعم، ووافقه فی هذا الجواب بعض الائمة۔‘‘(۱۱)

’’امام نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ایسے شخص کے متعلق سوال کیا گیا جس سے اس کی بیوی نے کہا کہ میرا تمہارے ساتھ گزارہ نہیں ہوتا، مجھے طلاق دے دے،شوہر نے کہا: تیری جیسی شکل والی کوطلاق دی ہوئی ہے اور کہتا ہے کہ میری نیت طلاق کی نہیں تھی تو کیا اس کی بات معتبر ہوگی؟ تو امام نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ہاں!بعض ائمہ کا بھی یہی جواب ہے۔‘‘

چوتھی صورت:

یہ ہے کہ شوہر کے کلام میں اضافت مذکور ہو، نہ ہی اس کا کلام جواب کے طور پر ہو،لیکن عرف

میں وہ لفظ یا تعبیر طلاق کے لئے مخصوص ہو اور جب وہ لفظ بولا یا تعبیر اختیار کی جاتی ہو تو اس سے بیوی کو طلاق دینا ہی سمجھا جاتا ہو، جیسے: ''طلاق مجھ پر لازم ہوگی یا حرام مجھ پر لازم ہوگا''۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے جس رسالے کا پیچھے حوالہ گزر چکا ہے، وہ دراصل ایک ایسے سوال کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے کہ شوہر نے طلاق دی مگر بیوی کی طرف اضافت نہیں کی، حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے شوہر کے عرف کو بنیاد بناتے ہوئے لفظی اضافت کے بغیر بھی وقوعِ طلاق کا فتوی دیا۔ امداد الفتاویٰ میں بھی ہے کہ عرف ہو تو اضافت موجود مانی جائے گی۔ مفتی ولی حسن ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''.... وقوعِ طلاق کے لیے اضافت لفظی ضروری نہیں، بلکہ اضافت معنوی بھی کافی ہو جاتی ہے، اضافت معنویہ کے لیے نیت یا عرف دونوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔ آج کل عرف عام ہے کہ لوگ ان الفاظ سے بیویوں کو طلاق دیتے ہیں.... حاصل کلام یہ ہے کہ یہاں نیت اور عرف موجود ہیں، اس لیے اضافت معنویہ کا تحقق ہو گیا....''(۱۲)

شامی میں ہے:

''وسيذكر قريبا أن من الألفاظ المستعملة: الطلاق يلزمني، والحرام يلزمني، وعلى الطلاق، وعلى الحرام، فيقع بلا نية للعرف الخ، فأوقعوا به الطلاق مع أنه ليس فيه إضافة إليها صريحا، فهذا مؤيد لما في القنية، وظاهره أنه لايصدق في أنه لم يرد امرأته للعرف، والله أعلم.... وإنما كان ما ذكره صريحا، لأنه صار فاشيا في العرف استعماله في الطلاق، لايعرفون من صيغ الطلاق غيره، ولا يحلف به إلا الرجال، وقد مر أن الصريح ما غلب في العرف استعماله في الطلاق، بحيث لايستعمل عرفا إلافيه من أى لغة كانت....''

ترجمہ: ''مصنف عنقریب بیان کریں گے کہ طلاق کے لیے مستعمل الفاظ میں سے یہ بھی ہیں کہ: 'طلاق مجھ پر لازم ہوگی، حرام مجھ پر لازم ہوگا، مجھ پر طلاق اور مجھ پر حرام' نیت نہ ہو پھر بھی عرف کی وجہ سے ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جائے گی.... بیوی کی طرف صریح اضافت نہ ہونے کے باوجود ان سے طلاق کو واقع قرار دینے سے قنیہ کی عبارت کی تائید ہوتی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اگر شوہر کہے کہ میرا مقصد اپنی بیوی کو طلاق دینا نہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، کیوں کہ عرف میں اس سے طلاق مراد ہوتی ہے.... مصنف نے جو لفظ ذکر کیا ہے، وہ صریح اس وجہ سے ہے کہ عرف میں طلاق کے لیے اس کا استعمال بہت ہی عام ہے، لوگ اس کے علاوہ طلاق کا کوئی لفظ جانتے ہی نہیں ہیں، اور مردوں کے علاوہ کوئی اس کے ذریعہ حلف بھی نہیں اٹھاتا ہے، پہلے گزر چکا ہے کہ صریح وہ ہے جس کا عرف میں زیادہ استعمال طلاق کے لیے ہوتا ہو، چاہے جس زبان کا بھی ہو۔''

پانچویں صورت:

اگر معنوی اضافت موجود ہے، مثلاً شوہر اپنی بیوی سے مخاطب ہے، مگر وہ صاف لفظوں میں طلاق کی نسبت بیوی کی طرف نہیں کرتا ہے، نہ ہی اس کے الفاظ کسی ایسے سوال کے جواب میں ہیں جس میں اس کی بیوی کی طرف اضافت موجود ہے اور وہ طلاق کے کوئی ایسے کلمات بھی استعمال نہیں کرتا جن سے اس کے عرف میں طلاق دینے کا رواج ہے تو پھر معنوی قرائن وشواہد کو زیر غور لایا جائے گا، اگر کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جس سے غالب قیاس یہ بنتا ہو کہ شوہر کی مراد اپنی بیوی کو طلاق دینا ہے تو طلاق کے وقوع کا حکم کیا جائے گا، البتہ اگر شوہر کا بیان یہ ہو کہ اس کا ارادہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کا نہ تھا تو اس سے حلف لیا جائے گا، کیونکہ قرینے کی وجہ سے اگر چہ وقوع طلاق کا احتمال قوی ہو جاتا ہے، مگر یقینی نہیں ہوتا اور اس کے کلام میں بہر حال طلاق کے علاوہ کی گنجائش موجود ہوتی ہے اور جب اس کا کلام محتمل ہے تو وہ رعایت کا بھی مستحق ہے، تاہم قرینے کی اور مضبوط قرینے کی موجودگی سے چونکہ اس کے موقف کے برخلاف وقوع کا ذہن بنتا ہے، اس لیے جس قدر رجان دار احتمال ہے اس کی تردید کے لیے دلیل بھی اسی قدر مضبوط ہونی چاہیے، اس لیے حلفیہ اس کے بیان کا اعتبار کیا جائے گا اور کوئی وجہ نہیں کہ حلف کے باوجود اسے سچا نہ سمجھا جائے۔ اگر غور کیا جائے تو حلف کی شرط طلاق کے اصولوں کے ہم آہنگ ہے، کیوں کہ کنایات میں بھی جب فیصلہ شوہر کے بیان پر ہوتا ہے تو اس سے حلف لیا جاتا ہے۔

''لا تخرجی إلا باذنی فإنی حلفت بالطلاق فخرجت لا یقع، لعدم ذکرہ حلفہ بطلاقها، ویحتمل الحلف بطلاق غیرها فالقول له ویؤیده ما ففی البحر، لو قال: امرأة طالق، أو قال: طلقت امرأة ثلاثاوقال: لم أعن امرأتی یصدق ویفهم منه أنه لو لم یقل ذالک تطلق امرأته لأن العادة أن من له امرأة إنما یحلف بطلاقها لا بطلاق غیرها فقوله: إنی حلفت بالطلاق ینصرف إلیها مالم یرد غیرها لأنه یحتمله کلامه۔''(۱۳)

ترجمہ... شوہر نے بیوی سے کہا کہ ''میری اجازت کے بغیر باہر نہ جانا، کیوں کہ میں نے طلاق کی قسم کھائی ہے'' بیوی باہر نکل گئی تو طلاق نہ ہوگی، کیوں کہ شوہر نے یہ نہیں کہا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کی طلاق کی قسم کھائی ہے، اس کے کلام میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے بیوی کے علاوہ کسی اور کو طلاق دینے کی قسم کھائی ہو، اس احتمال کی وجہ سے خاوند کی بات قابل قبول ہوگی۔ اس کی تائید بحر کے جزیے سے بھی ہوتی ہے کہ اگر شوہر نے کہا کہ عورت کو طلاق ہے یا کہا کہ میں نے عورت کو تین طلاقیں دیں اور وضاحت یہ کی کہ میں نے اپنی بیوی مراد نہیں لی تھی تو اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر شوہر انکار کرے تو اس کی بیوی کو طلاق پڑ جائے گی، کیوں کہ عادت یہ ہے کہ جس کی بیوی ہو وہ کسی اور کی نہیں، بلکہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی قسم کھاتا ہے۔ بہر حال اس کے یہ کہنے سے کہ میں نے طلاق کی قسم کھائی

ہے،اس کی اپنی ہی بیوی مراد ہوگی جب تک وہ بیوی کے علاوہ کوئی بیان نہ کرے، کیوں کہ اس کے کلام میں بیوی کے علاوہ کوئی اور مراد لینے کی گنجائش بہرحال موجود ہے۔

کفایت المفتی میں ہے:

’’....اگر زید قسم کھا کر کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی کو یہ الفاظ نہیں کہے تھے تو اس کے قول اور قسم کا اعتبار کرلیا جائے گا اور طلاق کا حکم نہیں دیا جائے گا۔‘‘(۱۴)

جواب: زید کے ان الفاظ (میں نے طلاق دی، اپنی والدہ سے مخاطب ہوکر اور پھر کہنا طلاق، طلاق، طلاق) میں جو سوال میں مذکور ہیں لفظ طلاق تو صریح ہے، لیکن اضافت الی الزوجہ صریح نہیں ہے، اس لیے اگر زید قسم کھا کر یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی کو یہ الفاظ نہیں کہے تھے تو اس کے قول اور قسم کا اعتبار کیا جائے گا اور طلاق کا حکم نہیں کیا جائے گا۔(۱۵)

سوال: ایک شخص کا اس کی بیوی کے بھائیوں کے ساتھ جھگڑا تھا اور جھگڑے کا سبب بیوی تھی، اس نے یہ الفاظ کہے ’’مجھ پر تین طلاق کے ساتھ مطلقہ ہے‘‘ اپنی بیوی کا نام یا اس کی طرف نسبت نہیں کی تو طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں جب بیوی کے حق میں یہ الفاظ ’’مجھ پر تین طلاق کے ساتھ مطلقہ ہے‘‘ کہہ دیے تو طلاق ہوگئی، اس لیے کہ طلاق بیوی کو ہی دی جاتی ہے، کسی اور کو نہیں دی جاتی، تاہم اگر شوہر قسم کھا کر کہہ دے کہ میری مراد بیوی نہیں تھی تو پھر طلاق واقع نہیں ہوگی۔ ...اگر شوہر کہے کہ میں نے طلاق نہیں دی اور لفظ یہ بیوی کے حق میں نہیں کہا تو قسم کے ساتھ شوہر کا قول معتبر ہوگا۔(۱۶)

چھٹی صورت:

اگر شوہر کے کلام میں اضافت کا احتمال بہت خفیف ہو تو طلاق کا وقوع شوہر کے بیان پر موقوف ہوگا، اگر وہ خود ہی وضاحت کردے کہ اس کی مراد اپنی زوجہ کو طلاق دینے کی تھی تو اقرار کے موافق وقوع طلاق کا حکم دیا جائے گا اور یہ تفصیل اس صورت میں تھی کہ جب شوہر کا کلام لفظی اضافت سے تو خالی ہو، مگر کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جس سے اغلب قیاس یہ بنتا ہو کہ شوہر کا مقصد اپنی بیوی تھا، لیکن اگر کوئی ایسا قرینہ بھی نہ ہو جو طلاق پر دلالت کرتا ہو تو طلاق کا وقوع شوہر کے بیان پر موقوف ہوگا، اگر وہ اضافت کا انکار کردے تو طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر اقرار کرلے تو طلاق ہوجائے گی:

’’سکران هربت منه امرأته فتبعها ولم يظفر بها فقال بالفارسية: ’’بسه طلاق‘‘ إن قال: عنيت امرأتي يقع، وإن لم يقل شيئا لايقع۔‘‘(۱۷)

’’نشے والے سے اس کی بیوی بھاگ گئی، اس نے پیچھا کیا، مگر اسے پکڑ نہ سکا، تو اس نے فارسی میں کہا ’’بسہ طلاق‘‘ (تین طلاق کے ساتھ) تو اس صورت میں اگر وہ کہہ دے کہ میں

نے اپنی بیوی مراد لے کر کہا ہے تو طلاق ہوگئی اور اگر کچھ نہ کہا تو طلاق نہ ہوگی۔''

''فرت ولم يظفر بها فقال: ''سه طلاق''، إن قال: أردت امرأتي يقع وإلا لا۔''(۱۸)

''بیوی بھاگ گئی اور شوہر اسے پکڑ نہ سکا تو اس نے کہہ دیا ''تین طلاق'' اگر شوہر کہے کہ میں نے بیوی کے ارادے سے کہا ہے تو طلاق ہوگی، ورنہ نہیں۔''

''لو قال: ''طالق''، فقيل له: من عنيت؟ فقال: ''امرأتي''، طلقت امرأته۔''(۱۹)

''ایک شخص نے کہا: ''طلاق ہے۔'' اس سے پوچھا گیا تو نے کس کو کہا ہے؟ تو اس نے کہا: ''اپنی بیوی کو''، تو اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔''

ان آخری دو صورتوں کا فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں طلاق واقع سمجھی جاتی ہے اور اگر شوہر انکار کرتا ہے تو اسے حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دوسری صورت میں طلاق کا وقوع ہی شوہر کے اقرار اور اظہار پر موقوف ہوتا ہے۔ اگر وہ کہہ دے کہ میرا ارادہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کا تھا تو طلاق کے وقوع کا حکم کیا جائے گا۔ لیکن وہ خود بیان نہ کرے تو اس سے حلف لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا ایک میں وقوع اصل ہے اور عدم وقوع کے لیے حلف کی ضرورت ہے، جب کہ دوسری میں عدم وقوع اصل ہے اور وقوع کے لیے صرف شوہر کے بیان کی ضرورت ہے اور یہ فرق اس لیے ہے کہ ایک میں وقوع کا احتمال قوی ہوتا ہے اور دوسری میں ضعیف ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱:......امداد المفتین، کتاب الطلاق، رسالہ حکم الانصاف، ص: ۵۰۸۔

۲:......مفتی ولی حسن، ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ ماخوذ از رجسٹر: ۱۰، ص: ۱۴

۳:......امداد الفتاویٰ، ج: ۲، ص: ۴۲۷۔

۴:......فتاویٰ دار العلوم دیوبند، کتاب الطلاق، ۹/۱۳۴۔

۵:......فتاویٰ دار العلوم دیوبند، ج: ۹، ص: ۱۲۹۔

۶:......رد المحتار کتاب الطلاق، مطلب سن بوش یقع بہ الرجعی، ۳/ ۲۴۸، ط: سعید۔

۷:......رد المحتار، ۳/ ۲۹۴، ط: سعید۔

۸:......رد المحتار، کتاب الطلاق، ۳/ ۲۴۸۔

۹:......الفتاوی الھندیۃ، الفصل السابع، ج: ۱، ص: ۳۸۴۔

۱۰:......الفصل السابع الطلاق بالالفاظ الفارسیۃ، ۱/ ۳۸۴ ط: پشاور۔

۱۱:......الفتاوی الھندیۃ، ۱/ ۳۸۵ ط: پشاور۔

۱۲:......کتبہ (مفتی) ولی حسن، ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ ماخوذ از رجسٹر: ۱۰، ص: ۱۴

۱۳:......رد المحتار، کتاب الطلاق، باب الصریح، ۳/ ۴۸، ط: سعید۔

۱۴:......کفایت المفتی، ج: ۶، ص: ۵۴، ط: دار الاشاعت۔

۱۵:......کفایت المفتی، کتاب الطلاق، ۸/۵۴ ط: دار الاشاعت۔

۱۶:......کفایت المفتی، ج: ۱۲، ص: ۲۷۴، مبوب ومرتب۔

۱۷:......الفتاوی الہندیہ، کتاب الطلاق، ج ۱، ص: ۳۸۲، ط: رشیدیۃ۔

۱۸:......رد المحتار، کتاب الطلاق، باب الصریح، ۳/ ۲۴۸، ط: سعید۔

۱۹:......رد المحتار، کتاب الطلاق، باب الصریح، ج: ۳، ص: ۲۴۸، ط: سعید۔

(جاری ہے)

www.banuri.edu.pk

مدارس میں پیشگی تنخواہ دینے کا حکم!

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

ا:-مہتمم مدرسہ کا ملازمین ادارہ کو قبل از وقت مشاہرہ ادا کردینے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ رقم امانت ہے اور پیشگی ادائیگی قرض ہے؟

۲:-کیا مہتمم، مدرسہ کی وقتی ضرورت سے زائد رقم سے کاروبار کرسکتا ہے یا کاروبار میں لگا سکتا ہے؟ جبکہ ا:-نفع خود لے،۲:-نفع مدرسہ کو دے،۳:-نفع اپنے اور مدرسہ کے درمیان برابر تقسیم کرے۔

۳:-مہتمم مدرسہ کی ملک میں مدرسہ کے فائدہ کی غرض سے تصرف کرسکتا ہے؟ مثلاً: بکرا فروخت کر کے مدرسہ کے لیے کوئی اور چیز لے لے یا گندم بیچ کر خورد ونوش کا اور سامان لے لے۔محترم مفتی صاحب! ان مسائل میں شرعی راہنمائی فرمائیں، جزاکم اللہ

الجواب حامدًا ومصلیًا

ا:...... مدرسہ کے ملازمین کو قبل از وقت مشاہرہ دینا قرض نہیں، بلکہ پیشگی اجرت ہے اور شرعاً مالِ وقف سے پیشگی اجرت دینا جائز ہے، لہٰذا مہتمم مدرسہ کا ملازمین مدرسہ کو قبل از وقت مشاہرہ ادا کرنا جائز ہے، چنانچہ شرح المجلۃ میں ہے:

”لاتلزم الأجرة بالعقد المطلق، يعنى لايلزم تسليم بدل الإجارة بمجرد انعقادها حالاً. والمراد بالعقد المطلق : الذى لم يذكر فيه اشتراط تعجيل الأجرة، وإنما لايلزم تسليم الأجرة حينئذ لأن العقد وقع على المنفعة، وهى تحدث شيئاً فشيئاً.

وشأن البدل أن يكون مقابلاً للمبدل بحيث لايمكن استيفاء ه حالاً لايلزم بدلها حالاً إلا إذا شرطه ولوحكمًا بأن عجله لأنه صار ملتزمًا بنفسه حينئذ، وأبطل المساواة التی اقتضاها العقد فصح''۔ (شرح المجلۃ:۲/۵۴۹، ط:رشیدیہ)

۲:......مہتمم مدرسہ کا مدرسہ کے لیے جمع شدہ رقم میں سے وقتی ضرورت سے زائد رقم کو کاروبار میں لگانا جائز نہیں، اگر چہ اس میں مدرسہ کا فائدہ ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ البحر الرائق میں ہے:

''**ولایجوز للقیّم شراء شیئ من مال المسجد لنفسه .....ولا البیع له وإن کان فیه منفعة ظاهرة للمسجد''۔** (کتاب الوقف:۵/۴۰۱، ط:رشیدیہ)

۳:......صورتِ مسئولہ میں مہتمم مدرسہ کا مدرسہ کی ایسی ملک کو فروخت کرنا جو وقف ہونے کی بنا پر نا قابل فروخت ہو اور اس کی جگہ کوئی اور چیز مدرسہ کے لیے خریدنا جائز نہیں، کیونکہ جب ایک مرتبہ کوئی چیز مدرسہ کے لیے وقف کر دی جاتی ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی ملک آ جاتی ہے اور اس میں اب کسی اور کا مملوک بننے کی صلاحیت نہیں رہتی۔

البتہ اگر واقعی مدرسہ کو کسی دوسری چیز کی ضرورت ہو اور وہ ضرورت مدرسہ کا بکرا فروخت کر کے ہی پوری کی جاسکتی ہو، اگر بکرا زکوٰۃ یا صدقہ واجبہ کا ہے تو بکرے کی تملیک کروالی جائے، پھر اس بکرے کو فروخت کرنا جائز ہو جائے گا، مگر اس طریقہ کو مستقل معمول بنالینا شرعاً درست نہ ہوگا، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

''**وعندهما حبس العین علی حکم ملک اللّٰه تعالٰی علی وجه تعود منفعته علی العباد، فیلزم ولایباع، ولایوهب، ولایورث''۔** (عالمگیری:۲/۲۵۰، ط:رشیدیہ)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد انعام الحق	شعیب عالم	ذوالقرنین
			تخصص فقہ اسلامی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

☆☆☆